# گرداب

افسانے

احمد ندیم قاسمی

ادارۂ اشاعت اردو
حیدرآباد دکن

قیمت تین روپیہ بارہ آنہ سکہ عثمانیہ

قیمت تین روپیہ چار آنہ سکہ کلدار

# گرداب

احمد ندیم قاسمی

ادارۂ اشاعتِ اُردو

حیدرآباد دکن

قیمت تین روپیہ بارہ آنہ
سکۂ عثمانیہ

قیمت تین روپیہ چار آنہ
سکۂ کلدار

اس مجموعے کے تمام افسانوں میں نام اور مقام فرضی ہیں


پہلا ایڈیشن ایک ہزار

جولائی سنہ ۱۹۴۳ء

دوسرا ایڈیشن ایک ہزار

اپریل سنہ ۱۹۴۵ء

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز

حیدرآباد دکن

# فہرس

| صفحہ | مضمون | سلسلہ |
|---|---|---|
| ۱۶۷ | غریب کا تحفہ | ۹ |
| ۱۸۳ | افیونی | ۱۰ |
| ۲۰۱ | ایک رات چوپال پر | ۱۱ |
| ۲۱۳ | رنگ و سنگ | ۱۲ |
| ۲۲۵ | فساد | ۱۳ |
| ۲۳۷ | انسان اور حیوان | ۱۴ |
| ۲۵۵ | ہسپتال سے نکل کر | ۱۵ |

# خورشید احمد خاں کے نام

جس کا خلوص
میری تحریروں کے نقطے نقطے میں
ایک جہانِ معانی تلاش کر لیتا ہے جس کی محبت و
شفقت بے کراں اور بے پایاں ہے اور جو فلسفے کا
طالب علم ہوتے ہوئے بھی روح کے وجدان اور
دل کے گداز سے بخوبی آگاہ ہے۔

ندیم

# دیباچہ

"زندگی کی وسعتیں لامحدود ہیں"۔ یہ فقرہ میں نے کسی کتاب میں پڑھا، اور معاً مجھے خیال آیا کہ دیہات کی معصوم فضاؤں سے نکل کر جدید تہذیب و تمدن کے اُن گہواروں کو بھی دیکھوں جو گڑگڑاتی ہوئی مشینوں اور گاڑھے بدبودار دھوئیں میں لپٹے ہوئے اُبھرے اور پھیلے جا رہے ہیں۔

یہاں کے مسائل الگ تھے، ماحول الگ تھا، لوگوں کی ذہنیتیں الگ تھیں، یہاں پتلونوں کی جمی ہوئی لکیروں اور بالوں کی متناسب لہروں کے تذکرے تھے۔ تصنع تھا، تکلف تھا، ریاکاری تھی، اور ان کے ساتھ ساتھ علم و فن کے چرچے تھے۔ یہاں نت نئی سازشوں کے راز فاش ہو رہے تھے، مصفّا چہروں کے پیچھے سماج کا پلیگ تعفّن پھیلا رہا تھا اور لباس حریر کے نیچے زخمی روحیں بلک رہی تھیں!

لیکن بہرحال یہاں بھی انسان ہی بستے تھے۔ میں نے یہاں جو کچھ دیکھا، جو کچھ سُنا اور جو کچھ محسوس کیا، وہ کہانیوں کی شکل میں پیش کر رہا ہوں۔ اس مجموعے کی بیشتر کہانیاں شہروں سے تعلق رکھتی ہیں۔ دور افتادہ دیہات کا رہنے والا شہروں کی رونق کے غلغلے سن کر نیلے پربتوں سے اُترا اور یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ یہاں رستے ہوئے ناسوروں پر بھی غازے کی تہیں چپکا دی جاتی ہیں تاکہ فیشن کے مذہب کا پورا احترام ہو سکے!

لاہور۔ جولائی سنہ ۱۹۴۳ء

احمد ندیم قاسمی

# کچھ اہل نظر سے

ادارۂ اشاعتِ اردو کی زندگی کا ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا۔ اس قلیل مدت میں سات ضخیم کتابیں اہل ذوق حضرات کے ہاتھوں تک پہونچ چکی ہیں۔ افسانوی ادب میں "گرداب" پہلی کتاب ہے۔ یہ احمؔد ندیمؔ قاسمی کے پندرہ تازہ اور منتخب افسانوں کا دلآویز مجموعہ ہے۔

احمؔد ندیمؔ قاسمی کی انفرادی خصوصیات، اچھوتی فن کاری، اور رسیلی زبان کی جھلکیاں آپ نے اس کی نظموں، قطعوں، اور دیہاتی افسانوں میں دیکھی ہونگی لیکن گرداب میں وہ اپنے آپ کو ایک نئے اور نرالے رنگ میں پیش کر رہا ہے۔ ان افسانوں میں ندیمؔ نے پربتوں اور میدانوں کی کھلی دُنیا سے نکل کر موجودہ پرشور تہذیب سے گونجتے ہوئے شہروں کی زندگی کا جائزہ لیا ہے یہ افسانے اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ کیونکہ ان میں مصنّف کا زاویۂ نگاہ بالکل جدید اور اچھوتا ہے۔

چودھری محمدؐ اقبال سلیمؔ گاہندری

# مسجد کے مینار

طلوعِ آفتاب سے چند لمحے بعد جب مسجد کے بلند میناروں کے سائے کوٹھی کے سبز قطعوں پر بچھ جاتے، اور قریب ہی میونسپل کمیٹی کے نلکے پر مزدور عورتوں کا ہجوم ہو جاتا۔ تو شوکت کوٹھی کے برآمدے تک آتی۔ اور تازہ اخبار کے پیچھے سے نصف چہرہ نکال کر مسکراتی، میں مینار کے سائے میں پھولوں سے لدی ہوئی ایک جھاڑی میں چھپا ہوا اپنے رومال کا ایک کونہ ہلاتا۔ وہ گھوم کر کوٹھی میں چلی جاتی، میں اُچک کر سڑک پر آجاتا۔ دُور شوکت کا ملازم اپنی کوٹھڑی میں کھانستا، کمیٹی کے نلکے پر کانسی کی گاگریں اور ٹین کی بالٹیاں بجنے لگتیں! اور میں شوکت کے چہرے کے غیر واضح خطوط کو تصوّر ہی تصوّر میں اُبھارنے کی کوشش کرتا ہوا جب گھر آتا تو میرا دوست کمال میرا منتظر ہوتا۔ چھوٹتے ہی پُوچھتا۔ "کیا ہوا؟" میں کہتا۔ "وہی مُرغے کی ایک ٹانگ"!

وہ میز پر پڑی ہوئی کتابوں سے کھیلتے ہوئے کہتا۔ "لیکن ایک ہلکی سی "رشتی" کر دو۔ مُرغا دوسری ٹانگ بھی ٹیک دے گا"!

اور میں جواب دیتا "ٹھیک ہے۔ لیکن میں ڈرتا ہوں کہ کہیں سرے سے

مُرغے کی ٹانگیں ہی نہ غائب ہو جائیں۔ اس لئے وہ ایک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے میرے لئے بہت ہے۔ میرا ارمان مختصر سہی۔ لیکن ہے بہت چلبلا!"

"کیسے!" وہ پوچھتا۔

"وہ یوں! میں روز کی دُہرائی ہوئی باتیں دُہراتا۔" کہ یونہیں سڑک پر جاتے جاتے کسی لڑکی کو دیکھ کر اُس پر فدا ہو جانا گو الف لیلیٰ کا افسانہ معلوم ہوتا ہے لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یوں بھی ہو سکتا ہے کم از کم میرا تجربہ یہی کہتا ہے۔ میرے افسانۂ محبت کی ابتدا ہی اتنی رنگین اور مبہم سی ہے کہ میں اس رومان کو چلبلا کہنے میں حق بجانب ہوں۔ اس کے بعد خطوط کا سلسلہ۔ پُراسرار بے معنی خطوط۔ جن کی لمبی چوڑی عبارت آرائیاں صرف ایک فقرے پر قربان کی جا سکتی تھیں کہ "تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔" میں شفق کی رنگینیوں اور چاند کی سیمیں دھندلکوں کے متعلق یوں لکھتا رہا جیسے ساری دُنیا میں صرف مجھی کو خدا نے بصارت کی نعمت سے نوازا ہے۔" کمال کھنکار کر کہتا "کاش! میں یہ خطوط پڑھ سکتا۔ دیوانے کی بڑ فلسفے کی جان ہے۔ اور تم تو دیوانے ہونے کے علاوہ فلسفی بھی ہو۔"

میں سگریٹ سلگا کر کہتا۔ اور اس کے بعد اس کا صرف ایک خط۔ جس میں لکھا تھا کہ "تم بے وقوف ہو—— اچھے لوگ بیوقوف ہوتے ہیں۔ اس لئے تم بھی اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ لیکن ہوشیار

موٹرڈرائیور ٹریفک کے ہجوم میں موٹر کی رفتار کم رکھتا ہے"! میری ہمت بندھی۔ میری رفتار تیز سہی لیکن یہ کیا کم تھا کہ شوکت کو میرے موٹرڈرائیور ہونے کا احساس ہو چکا تھا۔ تم جانتے ہو اس کے بعد میں نے اسے یہ سمجھانے کے لئے کیا کچھ نہ کیا کہ میں وہی ہوں جو تمہیں خط لکھا تھا۔ اور میں بہت اچھا ہوں، اور میں ہوشیار موٹرڈرائیور بننے کی کوشش کروں گا ـــ اور ـــ اور ـــ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو" اتنے عرفان کے باوجود ہم میں ابھی تک کوٹھی کے برآمدے سے لے کر پھولوں سے لدی ہوئی جھاڑی تک اسّی گز کا فاصلہ حائل ہے ـــ دل میں ایک کُریدسی ضرور رہتی ہے کہ اچانک یہ اسّی گز کا ٹکڑا پھسل کر کہیں ایک طرف نکل جائے۔ کوٹھی کا برآمدہ اور پھولوں سے لدی ہوئی جھاڑی ایک دوسرے سے مل جائیں اور ـــ"

"اور کیا؟" شریر کمال پوچھتا۔

"اور ـــ اور ـــ" اور ہم زور زور سے ہنسنے لگتے۔

لیکن یہ اسّی گز کا قطعہ زمین ایک طرف سرکنے سے تو رہا۔ اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں شوکت تک پہونچ سکتا۔ اور اس کا ملازم جو کوٹھی کے گرد ہر وقت یوں منڈلاتا رہتا تھا۔ جیسے نودمیدہ پھول پر بھنورا۔ اور ہر لمحہ بہ لمحہ میناروں کے سمٹتے ہوئے سائے جو دوپہر کو مسجد کی چھت پر چڑھ جاتے تھے۔ اور کچھ دیر کے بعد دوسری طرف لٹک جاتے تھے!

ان میناروں کے سایوں اور میرے ارادوں میں کتنی مشابہت تھی! بالکل اسی طرح وہ علی الصباح میرے دل و دماغ پر چھائے ہوتے۔ جونہی دن گزرتا۔ وہ گھٹنے لگتے اور آخر ایک دھندلے سے دائرے میں تبدیل ہو جاتے۔ لیکن جب پھر بڑھتے تو میرے دل و دماغ پر پھیلنے کے بجائے مایوسیوں اور نامرادیوں کے ناہموار قطعوں پر ——— رات کو میں بالکل مایوس ہو جاتا۔ اور میرے ارادے ان سایوں کی طرح اندھیرے میں کھو جاتے لیکن صبح اٹھتے ہی ان میں وہی زندگی ہوتی!

نفسیات اور فلسفے کے اصولوں کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے میں نے اپنے احساسات کی پٹاری کئی بار کھول کر بکھیر ڈالی لیکن یہ پرکھ بری طرح ناکام رہتی۔ کسوٹی پر کوئی ہلکا سا خط بھی نہ ابھرتا اور میں سوچنے لگتا کہ یہ احساسات یا تو کسی نہایت بدبخت انسان کے ہیں۔ یا کسی فوق البشر ہستی کے جس پر دنیا کا بنایا ہوا کوئی قانون منطبق نہیں ہو سکتا!

میری ہر حرکت میں ایک بے نام سی جھجک پوشیدہ تھی۔ خط لکھتے وقت میں الفاظ کو ٹیڑھا بنگا کر دیتا۔ اس خوف سے کہ مبادا ——— مبادا ——— بہر حال میں ڈرتا تھا۔ لیکن بھلا ہو اس جھجک کا۔ شوکت سمجھی نہ میں خوددار ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ خود میرے پاس آئے۔ اور آخر ایک صبح کو جب میں جھاڑی کے قریب دبک کر مینار کے سائے کی طرف کھسک رہا تھا تو ایک طرف سے شوکت اٹھی اور میرے مقابل آکر مسکرانے لگی!

بڑی پُر اسرار مسکراہٹ تھی وہ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے لپٹ جانا چاہتی ہے۔ اور یہ بھی محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی وہ مسکراہٹ زہریلا طنز لئے ہوئے ہے۔ اور شوکت مجھ پر جھپٹنا چاہتی ہو بہر حال وہ میرے سامنے تھی۔ کائنات ڈول رہی تھی۔ مسجد کے مینار لرز رہے تھے۔ اور کمیٹی کا نلکا جلترنگ بجا رہا تھا!

میں اُسی دبکی ہوئی حالت میں مُسکرایا اور بولا "زہے نصیب کہ ذرّہ ہے چاند کا ہمدوش!"

اور اُدھر سے شوکت کے ملازم نے ہانک لگائی۔ "بی بی جی — صاحب اخبار مانگ رہے ہیں!"

"کمبخت" وہ ہاتھ جھٹک کر بولی اور پلٹ کر برآمدے کی طرف چل دی۔ اس روز میں نے محسوس کیا کہ موسم کی تبدیلی سے مینار کا سایہ ذرا ایک طرف کو کھسک گیا ہے میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ شوکت نے "کمبخت" کسے کہا تھا۔ لیکن میرے لئے یہی بہت تھا کہ مجھے خُدا نے ایک مصرع کہنے کی توفیق تو بخشی! — اور سچ بات تو یہ ہے کہ اُس روز میں کئی بار شعر کہنے کے مسئلہ پر بھی غور کرتا رہا۔

شوکت برآمدے کے قریب گئی تو ادھر سے چپٹی ناک والا ملازم آیا۔ اور اخبار لے کر اندر چلا گیا۔ شوکت نے ایک بار پلٹ کر دیکھا تو سہی۔ مگر نہ دیکھنے کے برابر۔ ہوا کے ایک جھونکے نے اس کے چہرہ پہ دوپٹہ پھیلا دیا۔ اور میں سمجھا کائنات کو اچانک کسی بادل نے گھیر لیا ہو

میں اپنے آپ کو اندھا محسوس کرنے لگا!

جب شوکت اندر چلی گئی تو میں بہت دیر تک برآمدے میں ایک شفاف سائے کو لہراتے دیکھتا رہا۔ اور جب چند لمحے بعد کچھ فاصلہ پر عقب سے شوکت کے ملازم کی کھانسی گونجی تو میں گھبرا کر اٹھا اور اچک کر سڑک پر پہونچنا چاہتا ہی تھا کہ آواز آئی "میاں صاحبزادے بات سننا۔"

میں رُک گیا۔ چپٹی ناک والا ملازم تیز تیز قدم اٹھاتا میری پاس آیا۔ اور بولا۔ "تم یہاں کیا کر رہے تھے؟"

"کچھ نہیں" میں نے آواز کو بھاری اور ذمہ دارانہ بنانیکی کوشش کی۔

"تم یہاں کیوں آئے؟"

"ویسے"

"کیا؟"

"یونہیں"

"اور اگر تمہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔"

"تو میں تم اور پولیس دونوں سے نپٹ لوں گا۔"

اس کا گہرا سانولا چہرہ نیلا رنگ اختیار کرنے لگا۔ جیسے جسم کا سارا خون کھنچ کر اس کے گالوں میں بھر رہا ہے، وہ پلٹتے ہوئے بولا "تم نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑا ہے۔"

اور میں نے سڑک کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس

بھڑوں کا ڈنک جلانے کی دوا ہے۔"

میں حیران تھا کہ مجھ میں اتنی جرأت کہاں سے آئی! اور بعد میں مجھے اپنی اس زبان درازی پر پچھتانا پڑا۔ کہ میں نے خواہ مخواہ چلتی گاڑی اٹکانے کے لئے صاف راہ پر خود ہی روڑہ ڈال دیا۔ لیکن شوکت کی محبت اس کے ملازم کی دھمکی کے مقابلے میں زیادہ قابل توجہ تھی۔ اس لئے میں دن بھر شوکت ہی کے متعلق سوچتا رہا!

بدقسمتی سے مجھے فلسفے سے دلچسپی ہے۔ اسلئے زندگی کے ہر پہلو کو فلسفیانہ نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ آج کے واقعہ کو بھی میں نے اسی عینک سے دیکھا۔ اور بہت کچھ سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا کہ اگرچہ اس ضمن میں انسان مجبور ہے۔ مگر یہ مجبوری ایک لحاظ سے خود اختیاری ہے۔ شوکت کو ایک بار دیکھ لینے کے بعد اگر میں اپنے خیالات کو آزادی نہ دیتا تو یہ جھاڑیوں میں سانس روک کر دیکھنے اور چپٹی ناک والے ملازم کی ڈانٹ ڈپٹ کے روحانی عذاب سے تو محفوظ رہتا۔ آخر شوکت میں وہ کونسا سرخاب کا پر لگا تھا کہ اتنی وسیع دُنیا کے اتنے لاتعداد باشندوں میں سے مجھے وہی ایک وجود پسند تھا۔ کمزور یا ہیں —— بس یونہی ذرا جھکتی ہوئی سی! زردی مائل رنگت —— بس یونہی ذرا چمکتی ہوئی سی! عام آنکھیں —— بس ذرا ایک سحر سا لئے ہوئے! میں نے کئی بار تہیہ کیا کہ مجھے ہنٹنے۔ غزالی اور کانٹ کی بھول بھلیاں میں داخل ہو کر ایسی اَن دیکھی اَن جانی

راہوں پر گامزن ہو جانا چاہئے۔ جہاں میرا مقصدِ حیات صرف باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنا ہو۔ اور یہ راستہ مجھے مرتے دم تک نہ ملے، جیسے فلسفے کے تمام علمبرداروں کو نہ ملا۔ دراصل محبّت تو انسان کی زندگی میں جملۂ معترضہ کی حیثیت رکھتی ہے!

لیکن جب دماغ سے فلسفے کا پردہ سرکا تو شوکت کا شفاف ہیولیٰ عجیب و غریب انداز میں میرے چارطرف تیرنے لگا۔ اور میرے فلسفیانہ ارادوں کی جڑوں پر جیسے آرا چل گیا!

شام کا وقت تھا میں گھر سے نکل کر باغ کی طرف جا رہا تھا شوکت کی کوٹھی کے قریب سے گزرا تو وہ دور صدر دروازے کے قریب اپنے ننّھے سے بھائی کی انگلی تھامے باہر جا رہی تھی میں تیزی سے قدم اٹھاتا اس کے قریب سے گزرا اور کچھ آگے جا کر پلٹ کر دیکھا شوکت سڑک پر آہستہ آہستہ مٹکتی آ رہی تھی۔ گاہے ماہے ننّھے بھائی سے ایک دو باتیں کر لیتی اور پھر سامنے دیکھنے لگتی۔ جب مجھے یا صاف سیدھی سڑک کے آخری موہوم نقطے کو — اندھیرے کی وجہ سے میں یہ معلوم نہ کر سکا!

میں وہیں رُک گیا۔ سڑک صاف تھی اور منظر خوشگوار تھا۔ درختوں کے تاریک دھبّوں سے پرے کہیں کہیں کوٹھیوں کی کھڑکیاں چمک رہی تھیں۔ اور دُور پُوربئے طبلے اور تالیوں کی دُھن پر گیت گا رہے تھے ٥

سیل کو جاوے جب بھولی ملنیا
نین ملے سے لجاوے!

شوکت نہایت اطمینان سے میرے قریب سے ہو کر گزری۔ میں نے صبح کے التفات کا سہارا لے کر کہا۔ "شوکت۔"

"کون؟" گھبرائے ہوئے لہجہ میں اس نے پوچھا۔

"آپا۔ کون؟" شوکت کی طرف دیکھ کر ننھا آنکھیں جھپکانے لگا! اور میں نے بڑی مشکل سے حلق میں پھنسا ہوا گولا نگلتے ہوئے کہا۔ "میں خورشید۔"

وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر رُک گئی۔ اور بولی "تم نے میرے نوکر کو جھڑکا۔ وہ بڑا کینہ ور انسان ہے۔ جس سے چل جائے اُس کی بس کلیجے میں چھُرا گھونپ کر دم لیتا ہے!"

مجھے کسی پُرانی فلم کا ایک فقرہ یاد آگیا۔ "میرا کلیجہ تو پہلے سے ٹکڑے ٹکڑے ہے۔"

وہ بولی۔ "یہ لیلیٰ مجنوں کا ڈرامہ نہیں ہو رہا!"

میں گھبرا گیا۔ مجھے اپنے اس فقرے پر داد ملنے کی امید تھی۔ میں نے سوچا اب عام انسانوں کی سی باتیں کرنا چاہئیں۔ میں بولا "لیکن شوکت۔ کیا اب میں بالکل ناامید ہو جاؤں؟"

اس نے اپنے ننھے بھائی کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہارا دل تمہیں ناامید ہو جانے کو کہے تو میرا کیا بس؟"

"پر اب کیا ہوگا؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

اور وہ بولی۔ "رات کے دس بجے کے بعد ہماری کوٹھی کے جس کمرے میں روشنی ہوگی۔ وہی میرا کمرہ ہے۔ ذرا احتیاط سے آنا ہوگا۔ میں انتظار کروں گی!"

میں نے اپنے کئی احباب سے سنا تھا کہ کنواری لڑکیاں اتنی دلیر نہیں ہوتیں کہ خودبخود ملاقاتوں کے وقت مقرر کرتی پھریں۔ مرد کو چاہیئے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہے بغیر کسی انتظار کے کہہ دے۔ ورنہ عورت کا سب سے پہلا ہتھیار اس کا اٹل سکوت ہے، اسی لئے میں نے پہلی مرتبہ ایک مصرع الاپ دیا تھا۔ اور اب دوسری بار بھی میں نے ہی شوکت کو مخاطب کیا تھا مگر شوکت نے جس بے باکی سے مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ وہ ان تمام مفروضوں کی مدت کے لئے کافی تھی۔ دراصل نفسیات اور منطق کے ماہرین انسانی دل و دماغ کا مکمل تجزیہ پیش نہیں کر سکے۔ وہ ایک پردہ اٹھا کر خوش ہو جاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ اس کے پیچھے بھی ایک پردہ ہے!

شوکت چلی گئی۔ اور میں سوچنے لگا کہ کیا سائنس دانوں نے کوئی ایسا آلہ ابھی تک ایجاد نہیں کیا جس کی مدد سے اگر میں اپنی گھڑی کو سات کے بجائے دس پر لے جاؤں تو ساری دنیا کی گھڑیاں تین گھنٹے آگے سرک جائیں۔ ایک بار اپنی گھڑی کی سوئیاں پونے دس پر لے آیا۔ اور جب پلٹ کر ایک بابو سے وقت پوچھا تو وہ بولا۔ "سات بجکر تین منٹ۔"

ابھی تک صرف تین ہی منٹ گزرے ہیں" میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ مگر آواز قدرے بلند ہو گئی۔ بابو میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور یہ شعر گنگناتا آگے نکل گیا ؎

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

میں سمجھا میرا راز ڈنکے کی چوٹ سے گلی گلی میں فاش کیا جا رہا ہے۔ جی میں آئی بڑھ کر بابو کو دبوچ لوں! مگر پھر خیال آیا کہ اس شعر کا خالق اقبال ہے، اور پھر شعر بھی اچھا ہے!

میں بہت دیر تک سڑکوں پر بے مقصد بھٹکتا پھرا۔ آخر مجھے یقین ہو گیا کہ آج دس نہیں بجیں گے۔ آج وقت کے پر ٹوٹ چکے ہیں۔ آج ایک ایک پل ایک ایک صدی سے ٹکر لے رہا ہے۔ عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہوئیں مجھ سے! ٹریفک کے سپاہی نے ایک بار مجھے اپنی طرف بلا کر پوچھا۔ "شراب پی رکھی ہے تو نے؟"

میں نے کہا۔ "جی بخار ہے مجھے!"

اس نے میری کلائی اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "اُف۔ تم تو جل رہے ہو۔ پٹری پر چلو۔ موٹر وٹر کی زد میں آ جاؤ گے!"

جی میں آئی۔ کہہ دوں۔ پٹری پر چلوں یا سڑک پر۔ دس تو بجیں گے نہیں!

اور اچانک قریب کے ایک گھڑیال نے دس بجائے۔ میں

وہاں سے پاگلوں کی طرح دوڑا۔ اور میں سمجھا۔ پولس کا سپاہی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ ایک بار پلٹ کر دیکھا بھی۔ مگر یہ میرے اپنے بوٹ چیخ رہے تھے، شوکت کی کوٹھی کے سامنے باغیچے میں کوئی عجیب سا پرندہ کبھی اپنے پر ہلا رہا تھا۔ سڑک پر کبھی کبھی کوئی موٹر جیسے خود اپنی روشنیوں کے سروں کو پکڑنے کی کوشش میں دوڑتی ہوئی گزر جاتی تھی اور خوابیدہ فضا کا سینہ چھل جاتا تھا۔ کمیٹی کے نلکے کے قریب دو کتے کھیل رہے تھے مسجد کے مینار اندھیرے میں گومگو کی حالت میں کھڑے تھے اور ایک کمرے کے دو روشندان چمک رہے تھے!

میں ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی میں کھسکتا ہوا روشن کمرے کے قریب پہونچا ہی تھا کہ کسی نے میرے کاندھے کو چھوا سینے میں کوئی چیز اس زور سے سمٹی جیسے کسی فولادی پنجے میں جکڑ ڈالی گئی اور پھر غبارے کی طرح پھول کر اس دھماکے سے پھٹی کہ میری بہت سی سانسیں ایک ساتھ میرے پھیپھڑوں سے نکل کر بندوق کی گولی کی طرح ہوا میں سنسناتی ہوئی گزر گئیں۔

"یہ تو ابا جان کا کمرہ ہے خورشید میاں!" شوکت کی آواز آئی۔ اور میں نے اتنی گہری سانس لی۔ جیسے میں نے اپنی کھوئی ہوئی سانسیں پھر سے چوس لی ہیں۔

"شوکت!" میں نے آہستہ سے کہا!

"ہاں۔ ہاں۔" وہ بولی۔ "ہوں تو میں شوکت ہی۔ مگر یہ ابا جان کا

کمرہ ہے۔ اور تم موت کے منہ میں جا رہے ہو۔ وہ آج بیمار ہیں اور چند روز میرے کھُلے کمرے میں رہیں گے۔"

وہ مجھے بازو سے پکڑ کر ایک اندھیرے کونے میں لے گئی۔ اور بولی۔ "تمہارا اب یہاں روز بروز آنا ٹھیک نہ ہو گا۔ خُدا جانے ابا جان کب اچھے ہوں گے۔ اس لئے جس روز انھوں نے یہ کمرہ چھوڑا۔ میں مسجد کے مینار کے کلس کے ساتھ کوئی کاغذ یا کپڑا باندھ دوں گی۔ تم سڑک پر سے تو روز گزرتے ہی رہتے ہو۔ بس جس روز کوئی چیز مینار سے لٹکتی ہوئی دیکھو۔ رات کے دس بجے کے بعد روشن کمرے میں بے خوف آنکلنا!" میں نے کہا۔ "مگر تم مینار پر چڑھو گی کیسے؟"

بولی۔ "مسجد ہماری کوٹھی کے بالکل ساتھ ہے نا؟ اور پنجوں کے بل ہو کر ہاتھ لمبا کیا جائے تو کلس تک پہونچ ہی جاتا ہے!"

میں نے کہا۔ "اور شوکت۔ دیکھو۔ تم شاید نہیں جانتی کہ ——"

"میں سب کچھ جانتی ہوں۔" اس نے میری بات کاٹ کر فلسفہ کے امنڈتے دریا کے آگے بند سا باندھ دیا۔ "میں سب کچھ جانتی ہوں میں بھی بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"اور میں بھی بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس وقت میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ——!"

"میں یہ سب جانتی ہوں۔" وہ بولی۔

بقول نیٹشے۔ انسان کے تمام حواس ــــ"

روشن کمرے سے بوڑھی نحیف سی آواز آئی "شوکت بیٹا!"

"جی آئی" وہ پکاری۔ اور تاریک رات کو اور تاریک بناتی صرف یہ کہہ کر چلی گئی۔ "اچھا!"

میں برآمدے سے باہر نکلا تو دبک کر سرکنے کا خیال نہ رہا۔ صدر دروازے تک پہونچا ہی تھا کہ شوکت کے ملازم کی آواز آئی "کون ہے؟"

میں وہاں سے سرپٹ بھاگا۔ پیچھے اینٹوں کے ٹکڑوں کی بارش سی ہوئی۔ مگر میں ان کی زد سے باہر تھا۔ میں سڑک پر بھاگا جا رہا تھا کہ سوک گارڈ کا ایک سپاہی ایک درخت کے تنے کے قریب سے اٹھ کر بولا۔ "کون ہے؟"

میں اور تیزی سے بھاگنے لگا۔ ہر طرف سپاہیوں نے سیٹیاں بجائیں۔ اور چند لمحوں کے لئے شوکت کا خیال میرے دل سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔ میں جدھر جاتا سیٹیوں کی چیخیں زیادہ گنجان اور خوفناک ہوتی جاتیں۔ آخر پولس لائنز کی دیوار کے ساتھ دبک کر بیٹھ جانا پڑا۔ کئی سپاہی میرے قریب سے بھاری بھاری قدم اٹھائے گزر جاتے۔ اور میرے دل میں سیٹیاں سی بجنے لگتیں کافی دیر کے بعد میں وہاں سے اٹھا اور جب گھر آیا تو مجھے پانچ دنوں کے لئے گورداسپور جانا پڑ گیا۔ وہاں دادا جان علیل تھے اور والد صاحب نے

تار بھیجا تھا کہ میرے بغیر ان کی تیمارداری کے لئے کوئی شخص موجود نہیں! مجبوری تھی۔ دادا جان سے نفرت سی ہونے لگی! اباجان پر بھی غصّہ آیا۔ لیکن کیا ہو سکتا تھا۔ میں اسی روز گورداسپور چلا گیا۔ اور پانچ روز جس بے پناہ کرب میں گزرے ان کا بیان فضول ہوگا۔

دراصل عشق اور فلسفہ جب آپس میں ٹکراتے ہیں تو آپس میں یوں مدغم ہو جاتے ہیں کہ اس جذبہ کا نام انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں بھی نہیں مل سکے گا! کبھی سوچ آتی ہے "یوں کرنا چاہیئے"۔ اور پھر خیال آتا ہے آخر کیوں کرنا چاہیئے؟ عشق و محبت کی دُنیا میں "کیوں" کا گزر نہیں۔ یہ فلسفے کا بنیادی اصول ہے۔ لیکن یہاں عشق اور فلسفہ ٹکرا رہے تھے اور ساتھ ہی حُسن کا التفاتِ اوّلین اس درجہ سحر آفریں ہوتا ہے کہ وہاں فلسفہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔

سو جب میں گورداسپور سے واپس آیا تو گھر میں اسباب پھینک کر سیدھا شوکت کی کوٹھی کی طرف بھاگا۔ میرے قدم اس قدر تیزی سے اُٹھ رہے تھے کہ کئی سائیکلوں والوں کو میں اپنے پیچھے چھوڑ آیا۔ اور کئی اپ ٹو ڈیٹ لڑکوں نے دور سے ہانک لگائی "بابو جی۔ گاڑی تو کب کی چھوٹ گئی"!

ان کے قہقہوں سے بے پروا ہو کر میں اپنی دھن میں اڑا چلا گیا۔ اور جب شوکت کی کوٹھی قریب آئی تو میں مسجد کا اس طرف کا مینار

ڈھونڈھنے لگا۔ مگر مینار وہاں موجود نہ تھا۔

جی ہاں۔ مینار گر چکا تھا۔ اور شوکت کی کوٹھی سے دو بڑھیا عورتیں باہر نکل رہی تھیں۔ ایک پوپلے منہ والی کہہ رہی تھی "نوج زمانے نے کچھ ایسی قلابازی کھائی ہے کہ شرم وحیا تلپٹ ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب دیکھو تو بہنو۔ آخر شوکت بی بی کیا کرنے چلی تھی مینار پر ——— کلس سے جا کر لپٹی۔ وہ ٹوٹا اور بی بی دھڑام سے مسجد کے صحن میں! چودہ برس کی چھوکری۔ نمازیوں کے ہجوم میں بیہوش پڑی ہے۔ آدھ ننگی بہنو۔ آدھ ننگی۔ اور پھر غضب دیکھو ہاتھ میں اخبار کا اتنا بڑا کاغذ دھاگے سے بندھا ہوا۔ جانے کیا کرنے چلی تھی وہاں۔"

"پتنگ اڑانے چلی ہوگی۔" دوسری اپنی ناک پر انگلی رکھ کر بولی۔

اور بہن۔ پہلی پھر بولی۔ "رونا تو اس پر آتا ہے کہ ناک چپٹی ہو گئی بے چاری کی۔ تلوار ایسی ناک مینڈک بن کر رہ گئی!"

"کرموں کا پھل"! دوسری بولی۔

——— اور مجھے سڑک پر گزرنے والے سب لوگوں کی ناکیں چپٹی نظر آنے لگیں۔ میں گھر آیا۔ آئینہ اٹھا کر اپنی ناک دیکھ رہا تھا کہ اوپر سے مختار آ گیا۔ چھوٹتے ہی بولا۔ "کیا ہوا؟"

میں نے کہا۔ "جس عورت کی ناک چپٹی ہو اس کے متعلق

تمہارا کیا خیال ہے؟"

بولا۔"اُسے چپٹی ناک والے سے بیاہ دینا چاہئے۔"

اچانک مجھے شوکت کا ملازم یاد آگیا۔ اور پھر اس کے سائے نے ایک عجیب انداز میں نیٹشے کی شکل اختیار کرلی۔ میں نے اس کی بھاری بھرکم کتاب اٹھا کر اپنے آپ کو صوفے میں گرادیا! محبّت دراصل بیکاروں کا مشغلہ ہے۔ اور مسجد کے مینار کا ٹوٹنا محض سبب اور نتیجے کا ایک مضحکہ خیز ثبوت ہے۔

# کھوٹے سکّے

غمناک اور ویران شام تھی — ٹھیک میری آنکھوں کی طرح!
میں باغ میں ایک بینچ پر بیٹھا تھا، آس پاس رنگین مزاج نوجوان گھاس کے مخملی قطعوں پر بیٹھے۔ روشوں پر ٹہلتی اور چہلیں کرتی ہوئی لڑکیوں کو گھور رہے تھے۔ قریب ہی ایک کلب سے گاہے گاہے ٹینس کے بال کی دبی اور تیز "شپ" سنائی دیتی تھی۔ باغ کے آخری حصّے پر ایک ہوٹل میں ریڈیو بج رہا تھا۔ اچانک ایک طرف سے ایک موٹر فرّاٹے بھرتی ہوئی آئی اور میرے سامنے آکر اس زور سے رکی کہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی پھولے ہوئے گلابی گالوں والی ایک نوجوان لڑکی تقریباً اچھل گئی۔ ڈرائیور تیزی سے اتر کر پیچھے دوڑا اور کچھ دور جاکر کوئی چیز اٹھا لایا۔ لڑکی نے ہاتھ بڑھا کر وہ چیز اس سے لے لی۔ یہ ایک چرمی بٹوا تھا —— گھرررر سے موٹر چل دی۔ اور پھر سڑک پر ہلکے ہلکے غبار کا ایک طویل سلسلہ چھوڑ کر ہوٹل سے ورے غائب ہو گئی!
یہ سب کچھ اس تیزی سے ہوا کہ میری سانس رک گئی اور نبضیں تھم گئیں۔ اور جب میں نے اس واقعہ کے متعلق کچھ سوچنا چاہا۔ تو

شدت کی روحانی کشمکش کے بعد میں ایک لمبی سانس لے سکا۔ میں نے سوچا اگر اس لڑکی کو بٹوے کے گر جانے کی خبر نہ ہوتی اور موٹر بغیر رکے ہوٹل سے پرے اسی طرح غائب ہو جاتی۔ جیسے اب ہوئی ہے! اور پھر اتفاقاً اُدھر سے میرا گزر ہوتا! اور چرمی بٹوا میرے پاؤں تلے دب کر چیخنے لگتا تو—— تو جو درخواست میں نے آج ایک دفتر میں پچیس روپیہ کی کلرکی کے لئے دی تھی وہ واپس لے لیتا۔ کلرک مجھ سے پوچھتے "ارے! کہیں اور کام بن گیا"—— اور میں یوں مسکراتا۔ جیسے موٹر سوار پیدل چلنے والوں کو دیکھ کر مسکراتے ہیں!

بہت دیر تک میں یونہی بیٹھا سوچتا رہا کہ اگر یوں ہوتا تو کیا ہوتا—— اور اگر—— اگر میری وہ درخواست بھی رد کر دی جائے تو پھر کیا ہوگا!

بات یہ تھی کہ جمال آرا کے والد ایک دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ وہ میرے کمرے کے مقابل ایک بالاخانے پر رہتے تھے۔ بڑے صوفی منش اور پاکباز، ہر وقت تسبیح ہاتھ میں اور نظریں سرکاری کاغذات پر —— زبان پر تعزیرات ہند کی دفعات کا ورد اور تسبیح کے دانوں کی روانی مسلسل اور غیر مختتم!—— یہی وجہ تھی کہ جمال آرا کو اور مجھے ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ کر پتلیوں کی جنبش اور سلسلۂ تنفس کے اتار چڑھاؤ کی مدد سے بے معنی باتیں کرنے میں کوئی جھجک نہ تھی! البتہ جب وہ تسبیح کا ایک دور ختم کر کے۔ اور بھاری پلندے میں سے ایک ورق الٹ کر

اِدھر اُدھر دیکھتے تو ہم یوں کھانستے یا سر کھجاتے جیسی کسی بہت گہری سوچ میں مستغرق ہیں۔

جمال آرا نے ایک رات مجھے کہا کہ میں اس کے والد کے دفتر میں ایک درخواست دے دوں۔ اس نے وعدہ کیا کہ کسی نہ کسی طریقہ سے وہ اپنے والد کے پاس میری زیرِ دست سفارش کر دے گی۔ اور پھر جہاں وہ جائیں گے۔ مجھے بھی ساتھ لے جائیں گے۔ اس رات میرے دل میں امید کی چنگاری یوں چمکی۔ اور میرا مستقبل یوں جگمگایا جیسے کسی کھوٹے سکہ پر سورج کی کرنیں پڑنے لگیں اور وہ اپنی چمک دمک سے کھرے سکوں کو بھی شرمندہ کر ڈالے!

میں نے صبح اٹھ کر درخواست لکھی۔ اور جب جمال آرا کے والد صاحب دفتر جانے کے لئے سیڑھیاں اتر کر باہر گلی میں آئے تو میں نے آداب بجا لا کر عرضی پیش کر دی۔ مُسکرائے اور کہنے لگے۔ "اچھا تو آپ بے کار ہیں؟"

میں نے عرض کی "جی ہاں۔" "میں آپ کا پڑوسی ہوں اور پڑوسیوں کے جو حقوق اسلام نے مقرر کئے ہیں۔ اُن سے بھی آپ بخوبی واقف ہوں گے، بی۔ اے ہوں، مدت سے بھٹک رہا ہوں۔ ہر طرف سے مُنہ کی کھا کر آپ کی خدمت میں آیا ہوں۔ آپ مہربانی کریں گے تو میں عمر بھر آپ کی اور آپ کی اولاد کی خوش حالی کے لئے دعائیں کرونگا!"

فرمانے لگے "کہیں اور کام کیا ہے؟"

عرض کی۔ "جی میں یہی تو عرض کر رہا ہوں کہ مجھے کام کرنے کا کہیں موقع ہی نہیں ملا۔"

تسلّی دے کر دفتر چل دیئے اور میں دور تک ان کی جیب میں اپنی درخواست کا ایک کونہ دیکھتا رہا۔ اس کاغذ کی دھجی سے میرا سارا استقبل چمٹا جا رہا تھا! —— مستقبل کا خیال آتے ہی میں نے اوپر دیکھا۔ جمال آرا ناخنوں پر پالش کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور دبی آواز میں بولی۔ "منشی جی! —— میں ہنستا بل کھاتا برآمدے کے ایک کونے میں جا گرا!

جمال آرا کے والد صاحب چلتے وقت فرما گئے تھے کہ ہفتہ بھر کے بعد دفتر سے خبر لینا۔ اسی دن صبح مجھے ہفتہ بھر کے لئے شاہدرہ جانا تھا۔ وہاں میرا ایک قریبی رشتہ دار رنگسازی کے کارخانہ میں ملازم تھا۔ اُن کی بیوی پیٹ سے تھیں۔ اس لئے انھیں گھر بھیج کر ہوٹل پر روٹی کھاتا رہا۔ معدے پر بُرا اثر پڑا۔ بیمار ہوا۔ اور مجھے بلا بھیجا!

آج میں شاہدرے سے واپس آیا تھا۔ آکر کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور جمال آرا کو دریچے کے سامنے لانے کے لئے اتنا کھانسا کہ میرا گلا چھل گیا۔ برتنوں کے مانجھنے اور بچوں کے چیخنے کی آوازیں آتی رہیں۔ مگر جمال آرا نہ آئی۔ میں مایوس ہو کر باغ میں آگیا۔ کل مجھے دفتر جانا تھا۔ اب میری جیب میں صرف ایک چونی تھی۔ جس کے متعلق

میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ اس سے روٹی کھاؤں یا سینما دیکھوں۔ بیکاری کے اس طویل عرصہ میں مجھے روٹی کھانے اور سینما دیکھنے میں صرف یہی فرق محسوس ہوتا تھا کہ روٹی کھا کر سونے میں مزا ہے اور سینما دیکھ کر جاگنے میں!

اگرچہ پیٹ بھرنے میں بڑی لذت ہے مگر بھوک کا لطف بھی اس سے کسی طرح کم نہیں۔ جب بیٹھے بیٹھے انتڑیاں کھچتی ہیں اور تمام جسم میں ایک خواب آور سا تشنج چھا جاتا ہے۔ اور جب جھاگ بھری تھوک نگلتے وقت گلے کی سب رگوں کو طنبورے کے تاروں کی طرح کھینچنا پڑتا ہے! تو انسان چاہتا ہے کہ ساری دنیا بھوکی ہو جائے، اچانک خدائے رازق زمین پر سے کھانے پینے کی چیزیں اوپر آسمانوں پر اٹھا لے، اور سب لوگ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مسکراتے مسکراتے مر جائیں۔ مدت سے شانتا رام کی کوئی فلم نہ دیکھی تھی۔ اور "آدمی" کا ایک لمبا چوڑا اشتہار سامنے باہیں پھیلائے اپنا آغوش وا کئے مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ سینما دیکھنے کا فیصلہ کر کے میں باغ سے اٹھ آیا۔ مگر ابھی دوسرے شو کے شروع ہونے میں پورے دو گھنٹے باقی تھے۔

میں پٹڑی پر چلا جا رہا تھا اور دل ہی دل میں وہی خیال رہ رہ کر کروٹیں بدل رہا تھا۔ کہ اگر مجھے اس بھولے ہوئے گلابی گالوں والی لڑکی کا بٹوا مل جاتا تو جمال آرا کا احسان کیوں اٹھاتا اور دفتر سے

عرضی لے کر کلرکوں کے سامنے پھاڑ ڈالتا اور جیب سے چرمی بٹوے کا ایک سرا اوپر کھینچ کر سیٹی بجاتا باہر آجاتا۔ میری عمر پچیس سال کے لگ بھگ ہے لیکن آج تک مجھے ایک سوئی کبھی راہ پر پڑی ہوئی نہیں ملی۔ اور آئے دن لوگوں کی زبانی سنتا ہوں کہ "مجھے آج ایک روپیہ ملا" "سڑک کے کنارے دس روپیہ کا ایک نوٹ اڑتا جا رہا تھا میں نے اسے پکڑ لیا۔" "باغ میں ایک جھاڑی کے تلے بٹوا ملا ہے جس میں ستر روپے کے نوٹ اور ایک لڑکی کا فوٹو تھا۔" "یہ رومال ایک دفعہ لارنس پارک میں ایک بنچ کے نیچے پڑا تھا" —— "یہ فاونٹن پن —— غرض جتنے منہ اتنے جھوٹ!

آج میں نے تہیہ کر لیا کہ سڑک کے ہر طرف پوری توجہ سے دیکھتا جاؤں گا شاید مجھے بھی کچھ مل جائے! ان سڑکوں پہ سے روزانہ کئی ہزار لوگ گزر جاتے ہیں۔ کیا کسی کی جیب سے ایک پیسہ تک نہیں گرتا! کیا لاہور شہر میں رہنے والے کسی شخص کی جیب میں سوراخ نہیں! یہ ناممکن ہے میرا دل مجھے کہہ رہا تھا کہ آج سینما کے علاوہ کسی ہوٹل میں کچھ کھاؤں گا بھی! —— میں اس خیال سے اتنا خوش ہوا کہ پہلے ادھر اُدھر دیکھا اور جب کوئی شخص نظر نہ آیا تو زور سے اچھل کر ہنسنے لگا!

بجلی کے قمقموں سے ساری سڑک پر روشنی کا دریا موجزن تھا میں ہر طرف پورے غور سے دیکھتا جا رہا تھا کہ اچانک دور ایک کھمبے کے پاس مجھے ایک گول سی چیز چمکتی نظر آئی۔ میرے کان گونجنے لگے

——— دل ناچنے لگا۔

ایک روپیہ! ——— اور شاید نیا ہے جو اس درجہ چمک رہا ہے۔ میں نے چاہا چوتی جیب سے نکال کر دور پھینک دوں! ——— میں نے اس چمکتی ہوئی گول چیز پر نظریں گاڑے رکھیں اور ایک بار تو مجھے اس منور گولائی میں بادشاہ سلامت کا سر بھی اُبھرتا دکھائی دیا اور وہ نقش و نگار! وہ خوبصورت تحریر! ——— میرے قدم اس قدر تیز ہو گئے کہ میرے ٹخنے آپس میں ٹکرانے لگے۔ دوسری طرف سے ایک شخص آیا اور اس کے پاس سے گزر گیا۔ میں بھاگنے لگا۔ چمک بڑھتی گئی۔ میرا شک یقین میں بدلا جا رہا تھا۔ دس قدم ——— پانچ قدم ——— دو قدم ——— سڑک کے کنارے شیشم کے ایک سوکھے ہوئے ٹھنٹھ پر کوئی پرندہ زور سے چیخ کر چپ ہو گیا ——— میری انگلیوں میں ٹین کا ایک گول ٹکڑا کانپ رہا تھا اور دل ڈوب کر زخمی ٹخنوں کے قریب دھڑک رہا تھا۔ میرے جی میں آئی کہ اسے چٹکی سے مسل کر خاک کر دوں۔ اسے سامنے رکھ کر اس کا منہ چڑاؤں۔ میں نے گھبرا کر اُسے سڑک کے عین درمیان پھینک دیا۔ اور جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ اسی آن بان سے چمک رہا تھا ایک بار میرے دل میں کسی بسمل احساس نے کراہتے ہوئے کہا ارے تو نے اسے غلطی سے ٹین کا ٹکڑا سمجھا ہے۔ وہ دراصل روپیہ ہے لیکن ٹین کے پترے کی مُردہ جسم ایسی سردی میری انگلیوں کے پوروں میں ابھی تک موجود تھی۔ میں آگے بڑھ گیا!

میری ہمّت قدرے پست ضرور ہوئی۔ مگر جستجو کا شوق باقی تھا فلم شروع ہونے میں پونے دو گھنٹے باقی تھے اور پیلیس سینما ابھی بہت دور تھا۔ میں کبھی کبھی اپنے چاروں طرف ایک اچٹتی ہوئی ایک نگاہ ضرور ڈال لیتا تھا کہ شاید کوئی بٹوا — کوئی رومال — کم از کم ایک چونی — یا ایک پیسہ — یا ایک ریوڑی — صرف ایک ریوڑی جس کے تل چیونٹیاں چٹ کر گئی ہوں — آخر کچھ تو ملے کہ میں اس بھوکے احساس کی شکم پُری کر سکوں۔ میں اتنا بد قسمت تو نہیں — آخر پی۔ اے پاس کر لینا میری خوش بختی کی ایک مثال ہے۔ مجھے یقین تھا۔ مجھے کچھ ملے گا ضرور — ورنہ میں دیوانہ ہو جاؤں گا!

میں اسی سوچ میں غرق جا رہا تھا کہ میرے قدم آپ سے آپ رک گئے۔ مجھ سے دس بارہ قدم کے فاصلہ پر سگریٹ کی ایک ڈبیا پڑی ہوئی تھی۔ میری شکست خوردہ امیدوں نے پُکار کر کہا خالی ہو گی مگر دل پکارا "نہیں نہیں شاید دو چار سگریٹ موجود ہوں کوئی بھولے سے پھینک گیا ہو۔ بڑھ کر اٹھا لو۔ روٹی نہ سہی سگریٹ ہی سہی طبیعت مفرح ہو جائے گی!

میں نے آگے بڑھ کر ڈبیا اٹھا لی۔ بھاری بھاری معلوم ہوئی جی میں آئی بغیر دیکھے جیب میں ڈال لوں اور سینما ہال میں جا کر کھولوں مگر سینما ہال تک دل کی دھڑکن کے بے حد تیز ہو جانے کا احتمال تھا اب بھی میرے قدم زمین سے اکھڑ اکھڑ جاتے تھے۔ میں نے اللہ کا

نام لے کر ڈبیہ کھولی۔ قلعی کے چمکتے دمکتے کاغذ کو باہر کھینچا تو سگریٹ کے بجائے "دو آدمی" فلم کا ایک رنگین اشتہار لپٹا ہوا تھا۔ میں نے ڈبیا یوں پھینک دی۔ جیسے بے خبری میں بچھو اٹھا لیا ہو۔ میں پسینے میں شرابور ہو گیا۔ مجھے کوئی چیز نہیں ملتی۔ اور یہ لوگ روزانہ کچھ نہ کچھ پا لیتے ہیں — سب جھوٹ بکتے ہیں — بکواس کرتے ہیں! — جھوٹے — بکواسی!

اب سنیما ہال نزدیک تھا اور میں اپنی کوشش کو تقریباً بھول چکا تھا۔ کہ پٹڑی کے عین درمیان مجھے ایک رومال دکھائی دیا۔ جس پر بے شمار سبز اور سرخ رنگ کے پھول نظر آ رہے تھے اس کے چاروں کونے یوں پھیلے ہوئے تھے۔ جیسے کسی نے اس کو نہایت توجہ سے چُن کر صرف میرے لئے راستہ میں بچھا دیا ہے میرے قدم تیز ہو گئے۔ میری سانسیں تیز ہو گئیں۔ رومال کے رنگ بھی تیز ہو گئے!

ناگاہ ایک طرف سے ایک بابو لپکا اور رومال اٹھا کر آگے بڑھ گیا!

"مگر دیکھا تو میں نے تھا پہلے" میں نے کہنا چاہا۔ اچانک ابھی بابو نے اسی رومال سے بہت زور سے ناک پونچھی! اس نالائق نے میری ساری امیدیں چوپٹ کر دی تھیں۔ جی چاہا بڑھ کر اس کا گلا گھونٹ دوں۔ مگر اس خیال سے کہ غل غپاڑہ سن کر کہیں لال پگڑی والا نہ آن دھمکے اور چونی ہی نہ چھین لے۔ چپکا ہو رہا۔

مگر دل میں بار بار زہر میں بجھی ہوئی سوئیاں چبھتی تھیں۔ اور

میں اپنے چاروں طرف حریصانہ نگاہیں دوڑا کر اپنا سینہ مسل ڈالتا تھا۔ کہ اچانک سینما ہال کے پھاٹک کے پاس ہی مجھے سگریٹ کا سلگتا ہوا آخری ٹکڑا نظر پڑا۔ میں نے دیوانوں کی طرح جھپٹ کر اسے اٹھایا اور اس زور سے کش لگایا کہ میری انگلیاں اور ہونٹ جل گئے مگر دل کو سکون سا محسوس ہوا۔ آخر کوئی چیز تو مجھے بھی ملی۔ انگلستان کے کھیتوں میں اُگے معطّر تمباکو کا ایک اتنا طویل کش ـــ اور پھر مفت!

ـــ یہ خوش بختی نہیں تو اور کیا ہے! ـــ مگر ـــ مگر!!!

پہلا شو ختم ہو چکا تھا۔ میں لپک کر کھڑکی کے پاس آیا۔ اور سرمایہ دارانہ انداز میں چونی اندر پھینکتے ہوئے کہا "ایک ٹکٹ" ـــ میں نے سوچا اپنی ناکامی کے احساس کو ان سرد چھینٹوں سے خنکی پہنچانی چاہئے۔ ہم کسی کے دبیل تھوڑے ہیں کہ پیسے بھی دیں اور رونی مسکین آواز میں ہونٹ بھی لٹکا کر پکاریں "بابو جی۔ براہ کرم ایک عدد ٹکٹ تو عنایت فرمائیے گا۔"

میری چونی اچھل کر بابو جی کی ناک سے جا ٹکرائی۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور چونی کو میری طرف پھینکتے ہوئے کہا "کھوٹی ہے۔" چونی سیدھی میری ناک سے آ ٹکرائی۔

اگر کھڑکی کی سلاخدار نہ ہوتی تو شاید میں بابو سے الجھ پڑتا۔ چونی کا مس میری ناک میں بھڑ کے آتشیں ڈنک کی طرح سرسرانے لگا! ناچار پیچھے ہٹ آیا۔

گیٹ کے پاس ایک پرانا دوست مل گیا۔ جو ہمیشہ چونی کے درجے میں بیٹھا کرتا تھا۔ میں بھیڑ بھڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "بھئی تم مضبوط جوان ہو۔ لو یہ میری چونی میرا ٹکٹ بھی لے لینا۔" وہ ٹکٹ لے آیا تو بابو پر مجھے غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی۔ لیکن نہ اس نے میرے غصّے کو دیکھا نہ ہنسی کو۔۔۔ وہ کھوٹے اور کھرے سکّے پرکھنے میں مصروف تھا۔

ہم دونوں ہال میں جا بیٹھے! ابھی فلم کے شروع ہونے میں چار پانچ منٹ باقی تھے کہ میرا دوست بے اختیار ہنستے ہوئے پکارا۔ "بھئی مجھے تو یہ تماشا مہنگا نہیں پڑا۔ ابھی ابھی بڑے پھاٹک کے پاس ایک جھاڑی تلے مجھے ایک چمکتی دمکتی چیز نظر آئی۔ اٹھا کر دیکھی تو پارکر قلم!۔۔۔ دیکھو نا۔۔۔ دیکھو تو سہی۔۔۔ آج کل یہ تیس اٹھتیس روپے میں آتا ہے۔ اسے بہت اونچا نہ اٹھاؤ۔ کوئی دیکھ لے گا!"

ایک خوبصورت پن میری مردہ انگلیوں میں پڑا کانپ رہا تھا!

"اور یار" وہ بولا "میں نے ٹکٹ بھی کھوٹی چونی سے خریدا ہے" اور اس نے ہنستے ہنستے گھٹنوں میں سر دبا لیا۔

جی میں آئی اچھل کر پردے کے قریب جا گروں۔ اور وہاں کپڑے پھاڑ کر ناچنے لگوں۔ بال نوچوں، سینہ کوٹوں اور پکاروں۔ مجھے اس جہان میں کوئی چیز نہیں ملتی اور تماشا دیکھنے والو۔ ابھی ابھی میرے ایک دوست کو بڑے پھاٹک کے پاس ایک پارکر قلم پڑا ملا تھا۔ بولو یہ کس کا ہے!

رہ رہ کر مجھے یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ میرے پاس ایک ایسا شخص بیٹھا ہے جو کسی شریف آدمی کے قیمتی قلم پر غاصبانہ قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ اور میں کمبخت تین جگہ اس بُری طرح ناکام رہا ہوں کہ اگر مجھ میں ذرا بھی غیرت ہوتی تو میں کسی موٹر تلے آکر مر جاتا ـــ اور موٹر کا خیال آتے ہی پھولے ہوئے گلابی گالوں والوں لڑکی کی سطح تصوّر پر ابھری ـــ اور لڑکی کا خیال آتے ہی جمال آراء نے جیسے بالاخانہ کی کھڑکی سے سر نکالا ـــ اور ـــ اور ـــ کھیل ختم ہو چکا تھا۔

آدھی رات کو میں اپنے گھر آکر لیٹ رہا۔ جمال آراء کے کمرے میں اندھیرا تھا ورنہ کھانستا ضرور!

صبح ہوئی۔ دس بج گئے۔ مجھے نہ ہیڈ کلرک صاحب نظر آئے نہ ان کی صاحبزادی اور بالاخانہ اسی طرح آباد تھا۔ شاید جمال آراء کے کوئی رشتہ دار آئے ہوئے ہوں۔ اور وہ گلی والے کمرے میں آنے سے ہچکچاتی ہو۔ کنواری لڑکیوں کو ضرور ہچکچانا چاہئے۔ دل کو تسلّی دیتے ہوئے میرے دماغ میں شیخ سعدیؒ کی "گلستاں بوستاں" حلول کرتی ہوئی معلوم ہوئی!

گیارہ بجے کے وقت میں دفتر پہونچا۔ جمال آراء کے والد صاحب کی کرسی پر ایک سردار صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے اندر جاکر سلام کیا اور عرض کی۔

"مولوی زماں محمد کس وقت تشریف لائیں گے؟"

سب کلرک مجھے یوں گھورنے لگے۔ جیسے انھیں میرے دماغ میں کوئی ایسی رگ نظر پڑ گئی۔ جو اپنے مرکز سے ہٹ چکی ہے
ایک کلرک بولا "آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

"یہیں کا"

"تو آپ کو کچھ خبر نہیں! مولوی صاحب تو دو روز ہوئے گوجرانوالہ تبدیل ہو گئے ہیں۔"

ارے!

میں نے مسکین آواز میں کہا۔ "میں نے انھیں ایک عرضی دے رکھی تھی۔"

"تو وہ عرضی اپنے ساتھ ہی لے گئے ہوں گے۔" اور سب کلرک ہنستے ہنستے اپنی میزوں پر جھک گئے۔ اور سردار صاحب اپنا قلم داڑھی میں ڈالتے ہوئے بولے "یوں نہ کہو بھئی — یوں نہ کہو — بیچارہ خودکشی نہ کر لے" — اور وہ اپنی بھوری مونچھوں میں مسکرائے۔

میرا دل میرے سینے کے بجائے میرے دماغ میں دھڑکنے لگا! دھک، دھک۔ دھک دھک۔

"کیا خدا نے لوگوں کو چیزیں پانے اور مجھے چیزیں کھونے پر مامور کر رکھا ہے۔" میں نے سوچا "کھوٹے لوگ۔ کھوٹے سکے۔ کھوٹی تقدیر —" میں نے محسوس کیا۔ جیسے میرا جسم گوشت پوست کا نہیں۔ خالص سکے کا بنا ہوا ہے! کھوٹا انسان — میرے

ماتھے پر پسینہ پھوٹ پڑا!

میں دفتر سے نکل کر بازار میں آیا تو ایک دوکان کے سامنے وہی بھولے ہوئے گلابی گالوں والی لڑکی اپنی موٹر میں بیٹھی کوئی فلمی اشتہار دیکھ رہی تھی۔ اچانک اندر دکان سے ڈرائیور نکلا اور موٹر میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا!

کاش وہ اپنا بٹوا گرا جاتی! میں نے ایک آہ بھر کر کہا۔

ششش!

دکان کے پاس نالی کے ایک کنارے وہی چرمی بٹوا پڑا تھا!

مجھے ایک ثانیہ میں ایک سو پانچ درجے کا بخار ہو گیا۔

چپکے سے بٹوا اٹھایا اور پیچ در پیچ گلیوں میں سے ہوتا بھاگتا دوڑتا باغ کے اسی بنچ پر آن بیٹھا۔ دور دو سائیکل سوار سیٹیاں بجاتے اڑے جا رہے تھے۔ باغ ویران پڑا تھا۔

بٹوا میری انگلی کے ذرا سے مس سے چیخ اٹھتا تھا۔ جیسے پکار رہا ہے۔ "ارے مجھے جلدی کھول۔ ورنہ میں ابھی اپنا سارا سرمایہ گھاس پر اگل ڈالوں گا!"

میں نے اسے کھولا۔ پہلا خانہ دیکھا۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا۔

ربُّ العالمین! کیا موٹروں میں بیٹھنے والوں کے بٹوے بھی خالی ہوا کرتے ہیں۔

چوتھے خانے میں کاغذ کیطرح کوئی چیز چیخی اور میں نے شدت

جذبات میں اس خانے کو تقریباً پھاڑ ڈالا۔ اندر سے ایک کاغذ نکلا جس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے

پیاری نرملا۔

میں نے تمہارے پتا جی کو کل کرنسی آفس میں جاکر درخواست پیش کر دی تھی۔ تمہیں نے کہا تھا، اب تمہیں خیال رکھنا۔ بیکار رہتے رہتے جیون کو گھُن لگ گیا ہے کرپا کرنا۔

تمہارا پریمی
تُلسی

میرا اُنجار اُتر گیا۔ مُسکرا کر میں نے ایک انگڑائی لی۔ اور بٹوے کو جھاڑی میں پھینکتے ہوئے کہا —— "اِس دُنیا کے سب سکے کھوٹے ہیں —— کھوٹے لوگ —— ٹھیکری کی طرح کھوٹے اور —— اور بے حس!"

# نرم دل

میں بہت نرم دل ہوں، میرے احساس کا آبگینہ بہت نازک ہے، کل میں نے اپنے کمرے میں ایک مکڑی کو دیکھا، جو کھڑکی کے قریب اپنے بڑے سے جالے میں جھول رہی تھی۔ ایک جگہ اپنی مہین ٹانگیں روک کر، وہ اپنے سارے جسم کو یوں جھلا رہی تھی کہ مجھے اس کے گرد کوئی نامعلوم سا خطرہ چکر کاٹتا محسوس ہوا۔ وہ جھولتی رہی، جھولتی رہی اور اچانک لپک کر بڑھی اور ایک مکھی دبوچ کر واپس اپنے جالے کے مرکز میں آگئی، اور میں سمجھا، کائنات باریک اور دردناک چیخوں سے لبریز ہو رہی ہے! مکڑی نے آہستہ آہستہ میرے سامنے پھیلنا شروع کر دیا اور اچانک الف لیلہ کے جنات کی سی ہولناک صورت اختیار کر لی! میں نے ایک اضطراری حالت میں آنکھیں میچ لیں اور اپنے ملازم کو پورے زور سے پکار کر کہا "میں آج چائے نہیں پیوں گا۔"

قریب ہی باورچی خانے میں چینی کے برتنوں کی کھنکھناہٹ بند ہو گئی اور کواڑ کھول کر ملازم نے اپنا سر نکالا۔

"لیکن صاحب، چائے تو بالکل تیار ہے۔"

میں نے کہا "نہیں میں نہیں پیوں گا، میں نے ابھی ابھی ایک مکھی کو ایک ظالم مکڑے کا شکار ہوتے دیکھا ہے۔ میں مکھی کو مرتا اور دم توڑتا نہیں دیکھ سکتا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میری کمرے میں تیرتی ہوئی ایک ننھی سی جان جو اکثر میری میز پر بیٹھ کر گھڑیوں اپنے پر سنوارا کرتی تھی، اور اکثر کھانے میں میری شریک رہی۔ ایک بدصورت لٹنگی مکڑی کے جنگل میں پھنس جائے، اور مکڑی اس کا وہ سارا خون نچوڑ لے جو اس نے گوشت، گھی اور کھانڈ کا رس چوس چوس کر جمع کیا تھا۔ آج میرے کمرے سے مکڑیوں کے سب جالے اتار دو، سمجھے؟"

میرا مبہوت ملازم بالنس کے سرے پر چیتھڑے سے لپیٹ کر لایا اور جب میں نے خانماں برباد مکڑیوں کو دیواروں پر شکست خوردہ سپہ سالاروں کی طرح دوڑتے دیکھا۔ اور ان کے گھروں کو مسمار کرتا ہوا بالنس، ایک دیو کی طرح لپک لپک کر کونوں سے چھت پر اور چھت پر سے روشندانوں پر حملہ آور ہوا۔ تو میں نے ملازم کو ڈپٹ کر کہا چھوڑ دو، شوکت رہنے دو۔ بس اب باورچیخانہ میں چلے جاؤ۔ اور جب تک میں نہ بلاؤں۔ ادھر نہ آنا —— مکڑی نے مکھی کو دبوچا، میں نے مکڑی کو بے گھر کیا! اب میں محسوس کرتا ہوں، کہ یہ سراسر ظلم ہے —— کیا کروں میں بہت نرم دل ہوں میرے احساس کا آبگینہ بہت نازک ہے!"

ایک ذرا سے واقعہ سے قبل میرا احساس اس درجہ تیز نہ تھا،

اس وقت بھی میں نے ان مکھیوں اور مکڑیوں کی زبون حالت دیکھ پریشان ہو جاتا تھا لیکن یہ پریشانیاں، ان دنوں، میرے باریک مشاہدہ اور گہری نظر کا ثبوت تھیں۔ ایک معمولی سے واقعہ نے، جانے میری اس تیز نگاہی کو جنون میں کیوں تبدیل کر دیا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ میرے پڑوس میں غریب مزدور بستے ہیں۔ جو دن بھر منڈی میں بوریاں ڈھوتے ہیں اور شام پڑے واپس آتے ہیں۔ میں ایک روز دوپہر کو چھت پر ٹہلنے کے لئے گیا، تو ساتھ کی چھت پر مجھے ایک نوخیز لڑکی دھوپ میں اپنے بال سکھاتی نظر آئی۔ میری صنّاعانہ طبیعت کو یہ نظارہ بہت بھلا معلوم ہوا۔ چنانچہ اسے یہ بتانے کے لئے کہ وہ میری مسرت کا باعث ہوئی ہے۔ میں کھنکارا۔ پلٹ کر اس نے میری طرف دیکھا۔ وہ ناجو تھی۔ بوڑھے مزدور بخشو کی بیٹی۔ اس کے نیم وا ہونٹ۔ اور خوبصورت آنکھیں دیکھ کر میں نے یوں محسوس کیا۔ جیسے میرے ہونٹ پھڑپھڑا رہے ہیں اور آنکھیں مند رہی ہیں۔ مگر وہ خوفزدہ ہرنی کی طرح چھت پر سے بھاگی۔ مٹیالی چادر ہوا میں لہرائی۔ اس کی ننگی پیٹھ پر اس کے پھیلے ہوئے بال دو ایک بار گاڑھے دھوئیں کی طرح بکھرے اور وہ سیڑھیوں پر سے اترنے لگی۔ میں یہ دیکھ رہا تھا۔ اور مجھے اس بات کا کامل احساس تھا کہ اس وقت بوڑھا بخشو منڈی میں دو من کی بوری پیٹھ پر رکھے ہانپتا ڈگمگاتا جا رہا ہو گا۔ میں پکارا "ناجو!۔ ناجو!!" اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھنا چاہا، تو اس کا

پاؤں پھسل گیا۔ اور اس کا جسم سیڑھی کے آٹھ دس ڈنڈوں پر پٹختا۔ دھب سے نیچے جا گرا۔ آواز سن کر محلے کے دوسرے لوگ جمع ہو گئے اس لئے میں نے نیچے صحن میں جھانکنا مناسب نہ سمجھا اور اتر آیا۔ لیکن میرے دماغ میں ایک ایسی سوزش سی پیدا ہو گئی جیسے کوئی سوئی سے کرید کرید کر چبھے ہوئے کانٹے نکال رہا ہے!

دراصل مجھے ان عورتوں سے بہت نفرت ہے۔ جو مردوں کو اتنی دور چھتوں پر ٹہلتا، دیکھ کر یوں بھاگ کر نیچے اترتی ہیں، جیسے پرانے زمانہ کا کوئی راکھشس یا مرد لستمہ پا انھیں اپنے تاریک غار میں نظربند کر دینے کا ارادہ رکھتا ہو۔ آخر اس حجاب اور اتنی لاج کا مطلب؟ کیا یہ آرٹ کے منافی نہیں ہے!۔۔۔ وہ زمانہ اب بیت گیا جب مدفون خزانے الف لیلہ کی کہانیوں کے بادشاہ کو خوش کیا کرتے تھے۔ اب نقاب میں کوئی حسن نہیں رہا۔ اب چیتھڑوں سے، عرصہ ہوا، ترقی پسند زمانہ اپنے بوٹوں کی گرد جھاڑ چکا ہے۔ خیال خواہ کتنا ہی اچھوتا اور دلپذیر کیوں نہ ہو۔ جب تک دماغ میں پوشیدہ ہی شعر نہیں بن سکتا، اور شعر جب تک کتاب کے پیٹ میں ہے۔ بےکار ہے۔ اس کی صناعانہ قیمت لبوں پر آ کر ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ بازاروں میں وہ شعر نما عورتیں جنکو کالی لک بھری سڑک سے اٹھا کر دل کے خلوت خانے میں چھپا لینے کو جی چاہتا ہے۔ مجھ سے یوں کترا کر کیوں نکل جاتی ہیں، جیسے میں کوڑھی ہوں، اور میرے ذرا سے

مس سے اُن کے جسم میں کیڑے پڑ جائیں گے۔ اور کیڑوں کا خیال آتے ہی مجھے مکڑیاں اور مکھیاں یاد آجاتی ہیں —— دراصل میں دیوانہ ہو رہا ہوں!

ناجو پر اس وجہ سے مجھے غصّہ آیا، اتنی حیا کہ سیڑھیاں اترتے ہوئے اپنے جسم کا توازن کھو بیٹھی —— لیکن بھاگتے ہوئے میں نے اس کی زلفوں کو اس کی ننگی پیٹھ پر لہراتے دیکھا تھا۔ اور وہ جوان تھی اس کی بھری بھری باہوں میں تانبے کے دو کنگنوں کی دلفریب جھلک تھی —— دوسری عورتوں کی زلفیں اور باہیں بھی تو —— لیکن مجھے دوسری عورتوں سے کیا تعلق! —— ناجو میری پڑوسن تھی، غریب تھی، اور مجھے غریبوں سے بڑی ہمدردی ہے!

شام کو جب اس کا بوڑھا باپ منڈی سے واپس آیا تو ناجو کو اس حالت میں دیکھ کر سر پیٹ کر رہ گیا "ارے تو کیسے گری؟ کیسے پھسلا تیرا پاؤں؟ میں کئی بار تجھے کہہ چکا ہوں، کہ تو یہیں الگنی پر کپڑے لٹکا دیا کر دھوپ نہیں لگتی نہ سہی۔ ہوا ہی سے سوکھ جائیں گے۔ لیکن تو ہے کہ ہر وقت چھت پر دوڑی جا رہی ہے۔ اب چکھ لیا نا مزا —— شرم تو نہیں آتی تجھے؟ اب میں تیری دیکھ بھال کروں کہ منڈی میں جا کر بوریاں ڈھوؤں —— دوا دارو پر آج کل جتنا خرچ ہوتا ہے، وہ تو سب جانتی ہی ہے —— تیری ماں کی بیماری پر میں نے اپنا حقہ تک بیچ ڈالا تھا۔ بتا اب میں کیا کروں کم بخت!

میں یہ باتیں سن رہا تھا۔ اور جب دیکھا کہ بوڑھے میاں کی زبان غم وغصّہ کی شدّت کے باعث کترنی کی طرح چلتی جائے گی۔ تو اُسے آواز دی۔ وہ بھاگا بھاگا باہر آیا۔ اُلجھے ہوئے بھورے بال سال خوردہ چہرہ ——— جھریوں میں پسینے کی دھاریاں ——— رخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئیں اور گردن کا چمڑا لٹکا ہوا۔ مجھے دیکھکر حیرت زدہ سا ہو گیا۔ گھبرا کر بولا "آپ نے پکارا تھا بابوجی؟"

"ہاں بھئی، میں نے ہی بلایا تھا" میں نے نرم لہجے میں کہا "کیا ہوا تمہاری بیٹی کو؟"

"جی بس سیڑھیوں سے پھسلی اور ریڑھ کی ہڈی توڑ بیٹھی۔ اب پڑی کراہ رہی ہے، پوچھ پوچھ ہار بیٹھا ہوں کہ تو آخر گری کیسے۔ لیکن کروٹ بدل منہ بسور لیتی ہے، اور کچھ بتاتی ہی نہیں!"

"کچھ رقم کی ضرورت پڑے تو مجھے کہنا، تم میرے پڑوسی ہو غریب ہو۔ شریف ہو۔ یہ کسی قسم کا احسان نہیں۔ میں صرف اپنا حق ادا کروں گا!"

بوڑھے کے مرجھائے ہوئے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "اللہ ہر کسی کو بھلے آدمی کا پڑوس نصیب کرے، میں نے تو آپ کو پہلے ہی روز دیکھ کر دینو سے کہدیا تھا، کہ یہ نوجوان بڑا اشراف ہے۔"

ناجو کئی دن کھاٹ پر پڑی رہی۔ اس عرصہ میں میں نے

بوڑھے کو دس روپے دیئے جن سے وہ ناجو کے لئے دوا دارو خرید کر لاتا رہا۔ اور جب ناجو اچھی ہو گئی۔ تو ایک روز سر پر کوڑے کا ٹوکرا اٹھائے وہ میری بیٹھک کے سامنے سے گزری۔ میں نے پوچھا "ناجو وہ ریڑھ کی ہڈی کیسی ہے تمہاری؟"

اس کے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ آنچل سمیٹتی، کوڑا پھینک کر وہ ایک طرف مڑ گئی اور کہیں پرلی طرف کا چکر کاٹ کر اپنے گھر واپس چلی گئی۔ میری بیٹھک کا دروازہ بہت دیر تک منہ کھولے اس کا منتظر رہا۔ اور میرا دل یوں رک رک کر دھڑکتا رہا۔ جیسے موقع پاتے ہی چپ سادھ لے گا۔ ایک طرف آتشدان پر میری گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی اور باہر بوڑھا بخشو کھانس کھانس کر بلغم کے پٹاخے چھوڑ رہا تھا ــــــ شام ہو چکی تھی۔

رات کو لیمپ جلاتے وقت میں نے بیٹھک کے دروازے پر سے ایک سایہ سا گزرتا دیکھا اور جب میں لپک کر دہلیز تک آیا، تو باہر ناجو دیوار سے چمٹی کھڑی تھی!

"ناجو! کیا بات ہے؟"

پہلے تو وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ پھر نہایت دھیمی آواز میں بولی "بابو نے کہا ہے، آپ نے میری بیماری پر دس روپیے خرچ کئے ہیں آپ کی ــــ میں آپ کی بہت ــــ"

میں نے کہا۔ "ارے یہ میرا حق تھا نا۔ تم میرے پڑوسی ہو، غریب ہو،

شریف ہو، اور پھر اس روز اگر میں چھت پر نہ چڑھتا، تو تمہاری حیا کے دریا میں اتنا طوفان بھی تو نہ اٹھتا کہ بگولے کی طرح آن کی آن میں تم نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔"

"میں آپ کی ـــ میں آپ کی ـــ" وہ رک گئی، اور دامن سمیٹتی اپنے گھر چلی گئی۔ گھڑی کی ٹِک ٹِک بدستور جاری تھی! اور ایک پتنگا لیمپ کے شیشے پر بیٹھا۔ نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ "جل جائیگا کمبخت!" میں نے سوچا۔ اور جب میں نے اُسے اڑانے کی کوشش کی، تو وہ نیچے میز پر گر پڑا۔ یہ مکھیاں اور مکڑیاں اور پتنگے ـــ یہ ـــ موت کے کھلونے ہیں۔ مکھی جانتی ہے کہ سامنے مہین تاروں کی صورت میں موت نے اس کے لئے جال بُن رکھا ہے۔ مکڑی کو معلوم ہے کہ انسانوں کی جائے سکونت میں جالے تننا خطرے سے خالی نہیں۔ پتنگے کو خبر ہے، کہ لیمپ جل رہا ہے، اور آگ جلاتی ہے لیکن سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان بے زبانوں کی سوچ پر دھندلکے کس نے پھیلا دیئے۔ آخر عقل اور دیوانگی کا معیار کیا ہے؟ بل کھاتی ہوئی دھندلی لکیروں کے سولجھے واقعات کی تہ میں کچھ نظر نہیں آتا۔

مجھے مظلوموں سے محبت ہے اور معصوموں سے پیار۔ مجھے ان چیزوں سے محبت ہے جو جان رکھتے ہوئے بے جان کھلونوں کی طرح عاقبت نااندیش لوگوں کے ہاتھوں میں کھیلتی ہیں۔ اور اسی لئے مجھے نا جو سے اُنس سا پیدا ہو گیا۔ ٹھیک اس طرح

جیسے ایک بھولا بھالا سا بچہ سنسان گلی میں، ماں ماں پکارتا مل جائے اور اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس سے یونہی پوچھ لیا جائے "کیوں رے ننھے تیرا گھر کدھر ہے؟"

چینی کے خوبصورت اور منقش ظروف مجھے پسند ہیں۔ لیکن اگر وہ ٹوٹ جائیں۔ تو ان کی قدر و قیمت میری نگاہوں میں اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جزو کل دونوں کو میں اہم سمجھتا ہوں۔ شراب کی بھری ہوئی بند بوتل اپنی جگہ پر خوب ہے۔ مگر یہی بوتل اگر شراب خانے کے فرش پر گر کر ٹوٹ جائے اور ساری شراب خیالات کی طرح بکھر جائے، تو اس میں جمالیاتی نقطۂ نظر سے حسن پیدا ہو جائے گا۔ شیشے کی خوبصورتی ٹوٹنے میں ہے۔ شراب کی بہنے میں، اور عورت کی ــــــ گرنے میں! اناجو شاید اسی لئے مجھے پسند تھی۔

ایک شام وہ بازار سے سودا لے کر آ رہی تھی اور سڑک کے کنارے کنارے اینٹیں ڈھوئے ہوئے گدھوں سے بچتی بچاتی ہولے ہولے چل رہی تھی۔ میں اچانک اس کے مقابل آ گیا۔ "ریڑھ کی ہڈی کا کیا حال ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ میں جانتا تھا کہ سڑک کے آس پاس کوئی شخص موجود نہیں۔ صرف گدھوں والا گرد و غبار کے طوفان میں اپنے ایک بے زبان دوست کی پیٹھ سہلاتا سب کو ہنکائے لئے جا رہا تھا۔

وہ مسکرائی، اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے دل کی بہت سی

گرہیں اچانک کسی نے کھول ڈالی ہیں اور میرے جذبات کا پلندہ اِدھر اُدھر بکھر گیا ہے!

"تم مسکراتی ہو؟" میں نے کہا، اور اس کے ہونٹ آپس میں یوں پیوست ہو گئے، جیسے وہ عمر بھر مسکرائی ہی نہیں!

میں نے کہا "کوئی چیز خریدی؟" —— اور وہ میرے پہلو سے تیز تیز قدم اٹھاتی دور نکل گئی۔ جاتے وقت اس کے جسم کا ایک حصّہ میرے ہاتھ سے مَس ہوا۔ اور مجھے وہاں ایسی جلن محسوس ہونے لگی۔ جیسے کوئی انگارہ چمٹ گیا ہے۔ اور باوجود کوشش کے الگ نہیں ہوتا۔

یونیورسٹی ہال میں پروفیسر چکرورتی کا لکچر سننے کے بجائے میں گھر لوٹ آیا۔ اور دروازے پر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ میں ناجو سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا۔ کیسی باتیں؟ —— بہت کچھ سوچ بچار کے باوجود مجھے کوئی خاص بات نہ سوجھی۔ لیکن مجھے اتنا یقین ضرور تھا کہ میرے سینے میں بہت سی باتیں محفوظ ہیں جو صرف ناجو سے کہی جا سکتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کمیٹی کے نل سے پانی لینے کے لئے نکلی تو میں گردن باہر نکال کر بولا۔ "ناجو" —— وہ پلٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اور ٹین کا ڈول اُس کے کانپتے ہاتھوں میں ہولے ہولے کھسکنے لگا۔ میں نے دوبارہ کہا "ناجو"۔

وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر بولی "کہئے"

میں نے کہا۔ "ڈوڈو نہیں، تم چھت پر نہیں، گلی میں کھڑی ہو۔"

بولی "کہیے۔"
"سنو تو۔"

"مَیں سن رہی ہوں۔"
"تمہارا بابا سو گیا ہے؟"
"سو گیا ہے۔"
"کب؟"
"ابھی ابھی"
"تم کہاں جا رہی ہو؟"
"پانی لینے"
"پانی بھر کے لے آؤ۔ پھر کچھ تم سے کہوں گا۔"
وہ کچھ دیر سوچ کر بولی۔ "ابھی کہہ دیجئے۔"
"پانی بھر لو پہلے"۔۔۔۔ دراصل میں اس وقت کچھ کہنے کی جُرأت نہ کر سکا۔ میرا دماغ تپ رہا تھا! اس لئے پانی بھرا۔ ڈول اندر رکھا۔ اور میرے پاس آ گئی۔ مجھے اس بات سے گو نہ خوشی ہوئی کہ وہ مجھے بھولی نہیں، ورنہ آج کل کی لڑکیاں تو نوجوانوں سے یوں کتراتی ہیں، جیسے۔۔۔۔ لیکن مجھے دوسری لڑکیوں سے کیا تعلق! ۔۔۔۔ نا جو میرے پاس کھڑی تھی۔۔۔۔
وہ شرما کر بولی "کہیے"
"اندر آ جاؤ۔"

وہ میرے دروازے کی دہلیز سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔
"اندر آجاؤ۔" میری آواز کانپ رہی تھی۔
وہ خاموش کھڑی رہی۔
"دیکھو نا، ناجو۔" میں نے اسے زیادہ تنگ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ تم میری پڑوسن ہو۔ غریب ہو۔ شریف ہو۔ تمہارا باپ بہت بوڑھا ہے۔ وہ اب دو دو من کی بوریاں ڈھونے کے قابل نہیں رہا۔ اسے آرام کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ نے مجھے اتنا تو دے رکھا ہے۔ کہ تم دونوں کو دو وقت کے کھانے کا خرچ دے سکوں تمہارا حق ہے نا مجھ پر ــــ سمجھیں؟"
"میں نہ آپ کی ــــ میں آپ کی ــــ"
اور دیکھو نا، ناجو! اس روز میں نے تمہیں چھت پر دیکھا، تو مجھے تم بہت بھلی معلوم ہوئی تھیں۔ شریف لڑکیاں مجھے بہت پسند ہیں۔ اور تم جیسی شریف لڑکی تو شاید ہی میری نظروں سے گذری ہو جو شرما کر چھت پر سے چھلانگ لگا دے!"
وہ چپ چاپ کھڑی ناخن سے دیوار کریدتی رہی۔ میں اس کے قریب ہی تو بیٹھا تھا۔ میں نے اس کی انگلی پکڑی اسکے سارے جسم میں ایک ایسی تھرتھری دوڑ گئی۔ جیسے اونچے مضبوط درخت کی جڑ پر کلہاڑا پڑنے سے کانپ اٹھتا ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ کھینچا اور پھر اٹھا کر اسے چوم لیا! وہ میرے بازوؤں میں بیجان

لوتھڑے کی طرح لٹک گئی۔ باہر سڑک پر کوئی مزدور نل چلا رہا تھا، اور دور آسمان کے ماتھے پر چند تارے پسینے کے قطروں کی طرح لرز رہے تھے۔ میں نے اسے آہستہ سے کرسی پر ڈال دیا، اور اس کے بالوں، گالوں، بازوؤں کو تھوڑی دیر کے لئے یوں ٹٹولتا رہا۔ جیسے شوقین مزاج لوگ پھلوں کے ٹوکرے سے اپنی پسند کے پھل دبا دبا کر گھما گھما کر چنتے ہیں!

اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا تھا!

---

میں نے لیمپ کی زبان اونچی کر دی تھی۔ میں اسے بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ اس کے گنجان بال ـــــ اس کی سیاہ آنکھیں، موٹے موٹے تازہ آلوچوں جیسے ہونٹ اور پگھلے ہوئے تانبے کی رنگت والا جسم۔ سب کچھ میں نے جی بھر کے دیکھا۔ اس کی سانولی گردن پھٹے ہوئے قمیص سے نکلی ہوئی بھری بھری کہنیاں ـــــ اور شلوار کے کھلے پائینچوں میں سے اس کی جھانکتی ہوئی پنڈلیاں ـــــ میں نے سب کچھ دیکھا اور بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ اور جب میں نے بٹوے سے پانچ روپیہ کا نوٹ نکال کر اس کی سوئی ہوئی انگلیوں میں تھما دیا۔ تو اس نے کروٹ بدلی اور نوٹ کو بے کار کاغذ سمجھ کر اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر اس کا حلق خشک تھا صرف ہونٹوں پر زبان پھیر کر خاموش ہو گئی۔ اور میری طرف تپتی

آنکھوں سے دیکھنا شروع کر دیا ـــ وہ کچھ اس انداز سے لیٹی تھی۔ اور کچھ اس طرح اس نے دو تین بار میری طرف دیکھا، کہ مجھے اس پر ترس آ گیا ـــ میرا دل دراصل بہت نرم تھا!

بہت رات گئے وہ اٹھی۔ اور جب اس نے دروازہ کھولا۔ تو ایک خارش زدہ کتیا اپنے بیشمار ننھّے ننھّے پلّے پیٹ سے چمٹائے میرے دروازے کے ساتھ لگ کر نیند میں کراہ رہی تھی۔

"اُس کے اوپر سے پھاند جاؤ، ناجو۔" میں بولا "اسے جگانا نہیں یہ میری پناہ میں ہے۔"

اور ناجو مسکرا کر بولی۔ "آپ کتنے بھلے مانس ہیں، کتنے خدا ترس ہیں!"

اندھیری رات کی پر خوف سائیں سائیں میں مجھے اس خارش زدہ کتیا کا کراہنا بہت پیارا معلوم ہوا۔ اور دنیا کا کوئی ساز بھی تو ایسی آوازیں پیدا نہیں کر سکتا۔ تنہائی کے اس لق و دق صحرا میں یہ کتیا میری ہمسفر تھی۔ ناجو کی سانولی جوانی دیر تک میرے کمرے کی چھت دیواروں اور کرسیوں پر گھومتی اور تیرتی رہی۔ اور صبح کو جب میں آرام کرسی پر سے اٹھا۔ تو لیمپ اپنا سارا تیل چوس کر بجھ چکا تھا۔ اور میری آنکھوں کے پپوٹوں پر ایک نہایت ہی پیاری سوجن تھی۔ میں ساری رات خواب اور بیداری کے اس درمیانی حصّے میں گھومتا رہا تھا جس پر ہر طرف ناجو کی گنجان زلفوں کے سائے تھے!

ناجو سے میرا صنّاعانہ ارتباط دیر تک قائم رہا۔ ایک روز آرام کرسی پر

لیٹے ہوئے اس نے ایک مردہ پتنگے کے ابرقی پروں کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو پتہ ہے اب کیا ہونے والا ہے؟“

”کیا ہونے والا ہے؟ میں نے پوچھا۔ ”کوئی حادثہ برپا ہو رہا ہے کیا؟ اور دیکھو اس پتنگے کی نعش کو تو نہ بگاڑو۔ یونہیں پڑا رہنے دو بیچارے کو۔ صبح ہوا کے جھونکے کے ساتھ اڑ جائے گا۔“

وہ شرما کر بولی۔ ”آپ بس اب تھوڑی سی دیر میں باپ بننے والے ہیں۔“

میں نے پریشانی میں مردہ پتنگے کا جسم میز پر مسل دیا۔ اور دور چھت کے کونے میں کوئی مکھی مکڑی کے جالے میں پھنس کر بھنبھنانے لگی!

دراصل میں محبت میں بدنامی کا قائل نہیں۔ یہ سودا ان داموں بہت مہنگا ہے۔ رات کے اندھیرے نے میرے اور ناجو کے تعلقات کو ساری دنیا سے چھپائے رکھا۔ یہ بات صرف ناجو کے باپ ہی کو معلوم تھی۔ اور وہ صرف اسلئے خاموش تھا کہ منڈی میں مہینہ بھر کی محنت کے بعد دس روپیہ کمانے کے بجائے۔ یہاں گھر بیٹھے اسی تیس روپلے مل جاتے تھے۔ تجارت بری چیز نہیں اور صناعانہ نقطۂ نظر سے عورت کا جسم بھی اناج اور دھات کی طرح ایک جنس ہے!

ان دنوں اس کا باپ بیمار تھا۔ اور ہر وقت ”ناجو، ناجو“ پکارتا رہتا تھا۔ میں نے ناجو کو تسلی دی۔ کہ میں کسی اچھی دایہ کا انتظام کر لوں گا۔ اور اسے کوئی تکلیف نہ ہوگی لیکن میں خود بہت دیر تک

سوچتا رہا۔ کہ آگ جلاتے وقت میں نے یہ کیوں نہ محسوس کیا کہ دھوئیں کا چھت کی سوراخوں سے نکل کر آس پاس پھیل جانا لازمی امر ہے۔ بچے کی پیدائش میری سماجی زندگی پر کیا اثر ڈالے گی!——اگر میں بدنامی سے ڈر کر خود کشی کر لوں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں ایک معمولی آدمی ہوں۔ خود کشی ایک عامیانہ فعل ہے اس لئے اس کا خیال ہی فضول ہے۔ بچہ پیدا ہو جائے، پھر دیکھا جائے گا۔ کیا پتہ ہے اس کی پیدائش ہی اپنے ساتھ کوئی علاج بیتی آئے۔ چنانچہ میں نے مُسکرا کر ناجو سے کہا۔ "کوئی ہرج نہیں۔ آتا ہے تو آنے دو۔"

دو چار روز کے بعد ناجو کا باپ چل بسا۔ میں نے اس کے کفن دفن کا انتظام کیا۔ اور لوگوں نے میری قربانیاں دیکھ کر کہا۔ "کتنا شریف نوجوان ہے—— کتنا بھلا مانس اور خدا ترس۔ فرشتہ ہے فرشتہ!"

ناجو تین چار روز رو دھو کر خاموش ہو گئی۔ اور میرے پاس آئی۔ کہنے لگی "کوئی انتظام کیا ہے۔"

میں اس سے قبل ایک دایہ سے بات طے کر چکا تھا جو ایسے غیر شاعرانہ کاموں میں کافی مہارت رکھتی تھی۔ ناجو کو میں نے کہیں کسی اور محلے میں لے جانا چاہا مگر اسی روز جب میں اس کے مکان کے دروازے کے قریب سے گزرا تو اسے بند پایا۔ میں ہکا بکا اپنی بیٹھک کے دروازے تک آیا۔ یہ کھلا تھا۔ اندر جا کر دیکھا تو وہ میری

سونے والے کمرے میں کھلے پلنگ پر دراز تھی۔ اب مجھے یاد آیا کہ میں نے اسے اپنے مکان کی دوسری کنجی دے رکھی تھی۔ دایہ اس کے پاس جا بیٹھی اور میں اپنی بیٹھک میں آرام کرسی پر پڑا رہا۔ اور جب صبح پانچ بجے کا گجر بجا تو خارش زدہ کتیا اپنے بیشمار پلّوں کو اپنے ہمراہ بھگاتی آئی اور بیٹھک کی دہلیز کے ساتھ لگ کر سو گئی۔ دوسرے کمرے سے نومولود بچے کے رونے کی آواز آنے لگی۔ صبح کا وقت تھا۔ اور لوگ میرے مکان کے قریب سے گزر رہے تھے۔ بچہ نہایت ہی بھدّے طریقے سے رو رہا تھا جو مجھے ناگوار معلوم ہوا۔ یہ نومولود بچے دُنیا میں پہلا قدم رکھتے ہی کیوں رونا شروع کر دیتے ہیں!۔۔۔ اگر رونا ہی ضروری ہے تو روئیں مگر طور طریقے سے ۔۔۔ یہ کیا کہ بس روئے ہی چلے جا رہے ہیں اور پھر ایسے بچہ کا رونا تو بہت وحشتناک تھا، میں بھاگا بھاگا اندر گیا۔ دایہ کو کچھ وقت کے لئے رخصت کر کے میں نے ناجو کو پکارا۔ وہ کمزور اور نحیف آنکھوں سے مجھے گھورنے لگی۔

میں نے کہا۔ "ناجو بچّہ رو رہا ہے۔"

وہ خاموش رہی۔

"میں کہتا ہوں بچّہ رو رہا ہے۔"

وہ بدستور خاموش تھی۔

"ناجو! سن رہی ہو بچّے کی چیخیں۔"

"ہاں" وہ کراہی۔

"لوگ سن لیں گے۔"

"پھر؟"

اور بچہ بدستور روئے جا رہا تھا۔ میں بھاگا بھاگا باہر گیا۔ دروازے کی چٹخنی چڑھا کر پھر اندر دوڑ آیا۔ فضا میں ہر طرف مکھیاں اڑنے لگیں۔ دیواروں پر خوفناک مکڑیاں جنات کی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگیں۔ باہر خارش زدہ کتیا کسی راہ چلتے کی ٹھوکر سے بلبلا اٹھی اور اندر بچہ روئے جا رہا تھا!

"بچہ تو روئے جا رہا ہے ناجو" ____ جھریوں بھرا لوتھڑا شدتِ گریہ سے گٹھڑی بنا چلّا رہا تھا۔

کسی نے میرے دروازے پر دستک دی۔

میں بھاگا بھاگا باہر گیا۔ اس محلے کا بوڑھا مزدور دینو کھڑا صبح کی ٹھنڈ میں کانپ رہا تھا۔ بولا۔ "بابو جی۔ ناجو بیٹی کی کچھ خبر ہے آپ کو؟ دروازہ بند پڑا ہے اس کا۔ باپ کے غم میں کہیں منہ اٹھا کر تو نہیں چل دی؟"

میں نے کڑک کر کہا۔ "مجھے کیا معلوم۔ میں کیا جانوں ناجو کا حال؟"

وہ بولا۔ "جی وہ آپ کے پڑوسی ہیں نا!"

میں نے دروازہ زور سے بند کر دیا، اور پلٹا تو بچے کے رونے کی آواز زیادہ بلند ہو چکی تھی۔

"یہ مجھے تباہ کر ڈالے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ کلنگ کا ٹیکہ لگا دیگا میرے ماتھے پر۔"

"تو پھر؟" ناجو نے پلکیں جھپکا کر پوچھا۔

"پھر؟ —— پھر؟ ——!"

اور اچانک میرے دل و دماغ کو کسی سوکھے ہوئے ہاتھ نے اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ میری انگلیاں تن گئیں۔ میری آنکھوں میں خون تیر آیا۔ میرے ہونٹ کانپنے لگے۔ میرے نتھنے پھیل گئے۔ اژدھے کی طرح میری اکڑی ہوئی انگلیاں لپکیں! اور ننھی سی بھیگی ہوئی ملائم گردن میں پیوست ہو گئیں —— روئی کے گالے کی طرح نرم گوشت پچک گیا! "بابوجی۔ بابوجی"۔ ناجو نے وحشت میں اپنے اور میرے بال نوچ لیے اور ننھے ننھے پاؤں تین چار بار چرخی کی طرح گھومے اور میری کہنیوں سے ٹکرائے۔ اور پھر بے ہوش ناجو کے پہلو میں گوشت کا ایک سانولا سا لوتھڑا اپنا ننھا سا منہ کھولے جیسے میری پھبتی اڑا رہا تھا!

اور میں دروازہ بند کر کے لپک کر اپنی بیٹھک میں آ گیا۔ کیونکہ ناجو کے گلے میں غرغراہٹ سی ہو رہی تھی اور میں بہت نرم دل ہوں۔ میں مکھیوں۔ مکڑیوں۔ پتنگوں اور غریبوں کو دم توڑتا نہیں دیکھ سکتا دراصل میرے احساس کا آبگینہ بہت نازک ہے!

# استغنا

اختری کھوئی کھوئی سی رہنے لگی، ایک بوڑھی خادمہ اور ایک نئی نئی استانی، ڈھلتا بڑھاپا اور اٹھتی جوانی، آگ اور پانی میں اتحاد کیسے ہوتا! بات بات میں جھڑپ، بڑھیا تنگ آگئی، ایک روز جب اختری نے اسے گندے انڈے لانے پر ذرا سا کوسا، تو وہ بولی "لے بی بی، یہ پڑے ہیں تیرے دیگچے دیگچیاں، اور یہ پڑے ہیں وہ کپڑے، جو تو نے پچھلے مہینے سلا دیئے تھے، میں نے اس مہینے کی تنخواہ بھی بخشی، مجھ سے اب یہاں بسر نہ ہوگی، خاک چاٹ کر جی لوں گی، تیرے قورمے زردے نے تو میری زندگی اجیرن کر ڈالی۔

اور خلافِ معمول اس روز اختری کھل کھلا کر ہنس پڑی، بڑھیا کو دونوں شانوں سے پکڑ کر دھیرے سے جھنجھوڑا، اور بولی "لے اب رہنے بھی دے بڑی اماں، تھوک دے غصہ، تیرے بغیر تو مجھ سے اس شہر میں نہ رہا جائے گا۔ مجھ سے وعدہ لے لے۔ آج کے بعد اگر تجھے کسی بات پر ٹوکوں، تو میرے کان کتر لینا، میری توبہ!"

——— اور اختری نے اپنے کان پکڑ لیئے۔

بڑھیا کے ماتھے پر شکنوں کی شطرنج بچھ گئی، دھندلی آنکھوں پر پانی کی تہہ سی ابھر آئی۔ سوچنے لگی، اس اڑتی پھرتی چنگاری میں یہ خنکی کدھر سے آئی! اور پھر بدگمان سی ہو گئی جانے ان میٹھے الفاظ کے پردے میں کیا زہر چھپا ہے، اس مخملی دستانے کے نیچے جانے کتنا تیز فولادی پنجہ کلبلا رہا ہے، ابھی کوئی گلاس والاس لڑھک جائے گا مجھ سے، اور میری چودہ پشتوں پر برس پڑے گی۔ مذبذب حالت میں کچھ بول نہ سکی، پلٹی اور باورچی خانے کی طرف چلدی:

مگر اختری تو اس روز ربڑ کا غبارہ بنی پھرتی تھی۔ کبھی ادھر مٹک رہی ہے، کبھی ادھر اچھل رہی ہے۔ اب یہاں ہے، تو پلک جھپکنے میں وہاں، تھرک رہی ہے، پارے کی طرح تڑپتی اور کوندے کی طرح لپکتی، برآمدے سے باورچی خانے میں، باورچی خانے سے سونے کے کمرے میں، اور پھر آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھے اور گالوں پر گلاب کھل رہے تھے:

بات یہ ہوئی، کہ اس روز سامنے کے بالاخانے میں، ایک نوجوان کرایہ دار آ بسا، اختری یونہیں باہر گلی میں جھانک رہی تھی، اور وہ نیم وا کھڑکی کے پاس الماری میں کتابیں سجا رہا تھا! وہ دردناک سُروں میں یہ شعر گنگنا رہا تھا؎

نقاب ڈال رکھے ہیں دل فسردہ پر
کوئی سمجھ نہ سکا میرے مسکرانے کو

اور جانے کیوں، اختری کے کانوں کی لویں لال پڑ گئیں، ناک کا بانسہ

لرز اٹھا، لپک کر آئینے کے سامنے آبیٹھی، بالوں کو سنوارا، قمیص کو کھینچ کھانچ کر جسم سے چمٹا لیا۔ لپ اسٹک سے ہونٹوں کو آگ لگا دی، اور پھر دوڑ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی، نوجوان گا رہا تھا ؎

ترے جہاں میں ٹھکانا کہیں نہیں ملتا　　پروں پہ لیکے نہ اڑ جاؤں آشیانے کو!

اور اختری محسوس کرنے لگی، جیسے یہ ساری کائنات ایک سونا نگر ہے اور اس نگر کو بسانے کے لئے اس کی ایک نگاہِ ناز، ایک لطیف مَس، اور ایک مبہم اشارہ ہی بس ہے، اور یہی وجہ تھی کہ آج بڑھیا نے اختری کی منہ سے خلافِ معمول اچھے الفاظ سنے تھے! اور اس کا دماغ بھنّا سا گیا تھا!

دوسرے روز جب اختری اسکول گئی، تو لڑکیاں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ ”شاید آج نیا سنگار دان آیا ہے۔ استانی جی کا —— ”شاید آج استانی جی کو کوئی سوہنا سا خواب دکھائی دیا ہے“ —— ”آج موسلا دھار بارش ہو گی!“ —— اور اختری سر جوڑ کر کھڑی ہوئی لڑکیوں کو دیکھ کر سب کچھ بھانپ گئی، جب وہ قصبے کے ہائی اسکول میں آئی تھی، مٹیالے رنگ کی ایک ساڑی میں ملبوس رہتی، لبوں پر پھیکی پھیکی مسکراہٹ، آنکھوں میں سائے، چہرے پر چھائیاں اور چال میں سستی۔ لاہور ایسے شہر کو چھوڑ کر وہ اس قصبے کو ایک ویران سا محلہ محسوس کرتی تھی، یہاں اسے دھندلا سا لیمپ جلانا پڑتا جس کی روشنی میں اس کی آنکھیں دکھنے لگتیں، میری کوریلی کے ناول پڑھتی رہتی، اور جب ایک دو باب ختم کر لیتی، تو پریشان ہو کر اپنے آپ سے

پوچھتی، "اری کیا پڑھا تو نے؟ خاک بھی تو پلّے نہیں پڑا، جانے اس مغموم چھوکری کو وہ نوجوان ——" بہت دیر تک سوچتی رہتی، اور پھر کتاب کو دور پٹخ کر سونے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی، لیکن اسے بہت دیر تک نیند نہ آتی، اور جب آتی تو سنسان خوابوں کا ہجوم لئے، اور پھر اس کی کوئی سہیلی بھی تو نہ تھی جس سے جی بہلا رہتا اس کے نزدیک اس قصبے کی سب عورتیں دراوڑوں کی اولاد سے تھیں جنھیں نہ بدن ڈھانکنے کا ڈھب، نہ بات کرنے کا سلیقہ، تیل سے لپے ہوئے میلے چیکٹ دوپٹے، کھلی کھلی بھونڈی قمیصیں، بات بات پر مردوں سے بھی اونچے قہقہے، نہ امریکن فلموں کے تذکرے نہ جمپروں کے نئے ڈزائن، نہ میری کوریلی کے ناولوں پر بحثیں، بس گھی آٹے کا بھاؤ، اور ایک دوسرے کے گلے، صبح صبح وہ سکول جاتی واپس آتی تو دھم سے پلنگ پر، بڑھیا کو گھرکیاں، کروٹیں اور انگڑائیاں، مٹی کے تیل کی بو، اور بھینسوں کے گوبر کی سڑاند! وہ تو ان پچھلے دنوں سے استعفیٰ پیش کرنے کا بھی ارادہ کر بیٹھی، ابا کو بھی لکھا، وہ سٹپٹا کر یہاں دوڑے آئے، سمجھایا، بجھایا، تسلیاں دیں، بڑے گونجیلے الفاظ میں آنے والے دنوں کے عظمت کا خوف دلایا، اور پھر یہ بھی کہا، کہ سجاد اب کے ایم اے میں ضرور کامیاب ہو جائیگا، اور پھر! "پھر کیا؟" اختری نے سوچا، "وہ پشاور ہوں گے، تو میں نکودر ہوں گی، وہ میرٹھ جائیں گے تو میں قصور میں پڑی سڑتی رہوں گی۔"

لیکن اس نے ابا کے کہنے پر استعفیٰ دینے کا خیال دل سے نکال دیا۔ آج سے دو چار دن پہلے وہ پھر اسی معاملے پر غور کر رہی تھی کہ اچانک اس کی تقدیر نے پلٹا کھایا، اور مقابل کے بالاخانے کی کھڑکی آباد ہو گئی!

مسکراتی ہوئی لڑکیوں کو مخاطب کرتے ہوئے وہ بولی "آج تم سب کے لبوں پر تبسم کیوں کھیل رہے ہیں؟ نویں جماعت کی لڑکیوں کو اپنی استانی کے سامنے ایسے اکھڑ پنے کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے"۔۔۔

لیکن لڑکیاں بدستور مسکراتی رہیں، اور ایک نے تو جرأت کر کے یہ بھی پوچھ لیا۔ "استانی جی، وہ مٹیالے رنگ والی ساڑی کہاں کی آپ نے؟"

اور اختری مسکرا کر بولی۔ "اچھا یہ بات ہے۔ لیکن وہ دیکھو زہرا نے نئی قمیص پہن رکھی ہے۔ اور رادھا رانی کا دوپٹہ آج خلاف معمول اُجلا اُجلا ہے، اور وہ رشیدہ کے کانوں میں نئے جھمکے! ایں نے کوئی نئی بات نہیں کی"۔

لیکن لڑکیاں محسوس کر رہی تھیں، کہ یہ بالکل نئی بات تھی، اپنے اس نئے نئے راز کو یوں فاش ہوتا دیکھ کر وہ بہت گھبرائی، لڑکیوں کو بے وجہ جھڑکا، اور جب گھر واپس آئی تو بڑھیا کو اپنے چولے سے جوئیں نکالتے دیکھ کر آگ بگولہ ہو کر رہ گئی، بولی۔ "کیا انھیں ہاتھوں سے مجھے کھانا وغیرہ ۔۔۔" اور سامنے کی کھڑکی میں اسے ایک سایہ نظر آگیا!

بڑھیا اختری کے تیور جانچ کر بولی۔ "لیکن بی بی، کھانا پکانے سے پہلے ہاتھ دھو لیتی ہوں میں"۔

اختری نہیں چاہتی تھی، کہ اس وقت کوئی اس کے تصورات کے ہولے ہولے بہتی ہوئی ندی میں کنکر پھینک دے، بڑھیا کو خاموش رکھنے کے لئے، وہ مسکرائی اور بولی "میں نے کب کہا ہے، کہ تو ہاتھ صاف نہیں کرتی، تیری ایسی ستھری اور سگھڑ بڑھیا تو مغل شہزادیوں کو بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی" اور بڑھیا خوش ہو کر یوں ہنسی جیسے کوئی تیز رفتار گھوڑا کنکروں پر دوڑا جا رہا ہو،

سامنے کھڑکی سے دھوئیں کی پتلی پتلی دھاریاں لہراتی ہوئی نکل رہی تھیں، اور ان دھاریوں پر بہت دلآویز اور دردناک سی گنگناہٹ تیرتی آ رہی تھی، اختری کھڑکی کے پاس جا کر بہت دیر تک کھڑی رہی، اور انتظار کرتی رہی کہ اس تصویر میں یہ پراسرار مصوّر کوئی نیا رنگ بھرے گا، مگر دھواں اسی طرح اڑتا رہا، گنگناہٹ اسی طرح تیرتی رہی، صرف سورج کے مغربی افق تک پہنچ جانے کی وجہ سے یہ منظر دھندلا سا گیا، پلٹ کر وہ دروازے کے پاس گئی، اور بڑھیا کو چائے لانے کے لئے کہا، حیران بڑھیا باورچیخانے سے نکل کر بولی۔ "بی بی، چائے تو کب کی تپائی پر رکھ آئی ہوں میں!"

"اچھا" اختری مسکرائی، اور تپائی کے قریب آ کر چائے کی طرف دیکھا، تو زور زور سے ہنسنے لگی، اور بولی۔ "گرم چیزیں دیر تک ایک جگہ پڑے رہنے سے سرد ہو جاتی ہیں۔ بڑی اماں اٹھا لیجا طشت کو اور اس چائے کو پھر گرم نہ کرنا، بدذائقہ ہو جائے گی۔"

بڑھیا چائے اٹھا کر لے گئی تو اختری سوچنے لگی کہ یہ عجیب نوجوان ہے جو نہ کہیں باہر سیر کو جاتا ہے، نہ اپنے کمرے ہی میں ٹہلنے کی تکلیف گوارا کرتا ہے، کھڑکی میں سے بھی نہیں جھانکتا۔ سگریٹ سلگا کر بے مزہ اشعار گنگناتا رہتا ہے، اور دیر تک گنگناتا رہا ہے۔ لیکن اس کے یہاں آنے سے قبل میرا بھی تو یہی معمول تھا۔ ان دنوں میری کوئی سہیلی نہ تھی۔ کوئی ہمجولی نہ تھا۔ اکیلی تھی ہیں۔ لیکن اب جب میں چاہتی ہوں کہ وہ میرا دوست ہو جائے۔ میرے دل کو اس آرزو ہی سے تشفی مل رہی ہے۔ شاید یہ بھی اکیلا ہے، اسے بھی اس منحوس قصبے میں اپنا کوئی ہمخیال نہیں ملتا اور اسی لئے اس اندھیرے بالاخانے میں پڑا سڑ رہا ہے۔ اب اسے کون بتائے کہ تیرے بالاخانے کی مقابل کی کھڑکی میں تجھے اپنی ہمخیال اور ہم مذاق دوست مل جائے گی۔ لیکن وہ کھڑکی سے باہر دیکھے بھی تو۔ وہ تو کسی دیوار کی اوٹ میں بیٹھا جانے اب پڑھ رہا ہے یا سو رہا ہے یا سوچ رہا ہے، اب گنگناہٹ بند ہو چکی تھی۔ رات کی وجہ سے دھواں بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور ہنوز وہ کمرہ اسی طرح تاریک تھا۔

کھانا کھا کر اختری پھر کھڑکی کے پاس آبیٹھی۔ ایک بار سامنے ایک دیا سلائی روشن ہوئی۔ اور ایک مدھم سی روشنی پھیل گئی۔ شاید موم بتی جلائی تھی اس نے، یا کوئی گھٹیا قسم کی لالٹین۔ اور اس کے بعد وہی گنگناہٹ شروع ہو گئی۔ بہت رات گئے تک اختری وہیں

بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں دکھنے لگیں۔ کان بجنے لگے اور کل سے دل کی کونپل پر جو کلیاں مسکرانے لگی تھیں وہ جیسے کملا کر نیچے لٹکنے لگیں پلٹی اور دھم سے پلنگ پر جا گری۔ بہت دیر تک سوچتی رہی کہ یہ عجیب پر اسرار نوجوان ہے جو اپنے آپ کو اس اندھیری چار دیواری میں اس شدت سے جکڑے ہوئے ہے، خدا جانے اس کے خیالات کیا ہیں۔ جذبات کیا ہیں۔ اس کی افتاد طبع کیسی ہے، کیا شغل ہے اس کا، یہ تو میرے لئے الف لیلہ کا کوئی کردار بنتا چلا جا رہا ہے، اور میں کتنی بیوقوف ہوں کہ ایک مبہم سے خیال کے زیر اثر اتنی دیر تک جاگتی رہی۔ اور پھر آج اسکول میں خواہ مخواہ لڑکیوں کے استہزا کا نشانہ بنی۔ چائے بھی تو نہ پی جس کے بغیر میں اپنے آپ کو برف کا تودا سمجھنے لگتی تھی۔ کوئی کام بھی تو نہ کیا۔ اور وہ میری کوریلی کے ناول میں اس مغموم لڑکی کو وہ نوجوان —— وہ اٹھی ناول کھولا اور ایک صفحہ کی تلاش میں تھی کہ اسے نوجوان کی گنگناہٹ بلند ہوتی ہوئی سنائی دی۔ پلنگ سے کھسک کر وہ کھڑکی کے قریب پہنچ گئی۔ لیکن نہ جانے کیوں اب وہ اپنے آپ کو اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایک طرف دبکی کھڑی رہی۔ اور وہ نوجوان کھڑکی سے باہر سر نکالے یہ شعر گاتا رہا؎

مجھے بھی رخصتِ تعمیرِ آشیاں دیجئے
چلے ہیں آپ اگر بجلیاں گرانے کو

اختری نے کئی بار ارادہ کیا کہ ہمت کر کے کھڑکی کے مقابل آ جائے

لیمپ کی روشنی تو کسی حالت میں اس کے چہرے پر نہ پڑ سکے گی۔ اور پھر اس نوجوان کا چہرہ بھی تو نظر نہیں آتا۔ اُس کھڑکی میں بھی ایک سایہ۔ اس کھڑکی میں بھی ایک سایہ۔ ایک دوسرے کے سائے دیکھ کر شاید ــ شاید ــ شاید کیا! اس کے دل میں چند ناپاک خیالات آئے، ناپاک اس لئے کہ دسویں جماعت میں پڑھی ہوئی ایک مذہبی کتاب کے نقطۂ نظر سے اس قسم کے خیالات کنواری لڑکیوں کو زیب نہیں دیتے تھے۔ اور ابھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ نوجوان پیچھے ہٹ گیا۔ اور اختری کھڑکی کے مقابل دیر تک کھڑی رہنے کے بعد پھر اسی طرح پلنگ پر آ گری۔

اس نے اپنے دل میں چمکتی ہوئی چنگاریوں پر راکھ ڈال کر اُنھیں بجھانے یا کم از کم چھپانے کی بہت کوشش کی مگر وہ پھر سطح پر اُبھر آئیں۔ اور وہ کروٹیں بدل بدل کر اپنے شانے جھلتی رہی نیند آئی تو انھیں سنسان خوابوں کو ساتھ لئے، اور جب صبح اٹھی تو کھڑکی سے اسی طرح دھواں اور دھوئیں کے ساتھ گنگناہٹ باہر تیری جا رہی تھی۔ اور یہ دھوئیں اور گنگناہٹیں پیدا کرنے والا نظر نہ آتا تھا۔

یوں تو گزر نہ ہو گی۔ اس نے سوچا۔ جرأت کرنی چاہیئے لیکن ایک کنواری لڑکی ہوتے ہوئے یہ جرأت کرنے کا خیال ایک خواب سا بن جاتا۔ وہ چاہتی کہ یونہی آپ ہی آپ، بغیر کسی قسم کے تردد کے وہ ادھر توجہ کرنے لگے تو ذرا یہ دن اچھے گزر جائیں گے۔ شہری معلوم ہوتا ہے

اور پھر پڑوسی بھی ہے، اسکول کے بعد اکٹھے چائے پی لی۔ یا ادب کے متعلق دو چار باتیں کر لیں۔ بس۔ میں اور کیا چاہتی ہوں کچھ نہیں بس ذرا وقت اچھا کٹ جائے گا۔ اس کا بھی اور میرا بھی۔ اور میرا کیا ہے، میں تو تین مہینے پہلے بھی جیتی چلی آئی، یہ بیچارہ یہاں بیمار پڑ جائے گا۔ اس کا اپنا بھلا ہے اس بات میں۔

اچانک اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ نوجوان سامنے کھڑکی میں سے باہر جھانک رہا تھا۔ لمبے لمبے پریشان بال۔ بڑی بڑی اداس آنکھیں۔ باوقار لیکن پژمردہ چہرہ۔ اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور جب سیدھا ہوا تو اچانک اس کی نظریں اختری پر جا پڑیں جو اس کے بالکل مقابل بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے وہ سن ہو کر رہ گیا۔ رنگ فق ہو گیا اور آنکھوں پر گھنی بھنویں جھک آئیں۔ اختری کو اپنی طرف متوجہ پا کر وہ نیچے دیکھنے لگا۔ اور پھر گھوم کر ایک طرف ہو گیا۔ اور اختری نے آج پھر سنگار دان کو ایک گھنٹہ تک استعمال کیا۔ اور یوں بن ٹھن کر نکلی کہ اسکول کی لڑکیاں اسے دیکھ کر دم بخود سی رہ گئیں۔ دن بھر وہ لڑکیوں کو لطیفے سناتی رہی اور پھر میری کوریلی کی ایک ناول کا پلاٹ بھی سنایا۔ اور پھر جب وہ اس مغموم لڑکی کی باتیں کر رہی تھی جسے وہ نوجوان ——— ! تو وہ اچانک رک گئی! اور لڑکیوں نے ایک زبان ہو کر پوچھا "آگے استانی جی؟"

"بس میں نے یہیں تک پڑھا ہے۔" اس نے گھبرا کر جواب دیا۔

اور لڑکیاں اداس سی ہوگئیں۔ جانے وہ نوجوان ——! یہ نشتر ان کے دلوں میں چبھنے لگا اور جب اختری گھر واپس آئی تو یہی سوچ رہی تھی کہ جانے وہ نوجوان —— خدا جانے کوئی اپنی تقدیر کو کیا سمجھے مستقبل کے متعلق سوچنا تو بیکاروں کا مشغلہ ہے۔ ورنہ سوچ سوچ کر ناحق جی ہلکان ہوتا رہتا ہے اور پھر ہوتا وہی ہے جو مقدر میں لکھا ہے، لیکن جانے ——!

بڑھیا کی خوشامد کرتی وہ اپنے کمرے میں آئی۔ دیر تک لباس نہ بدلا۔ شاید وہ نوجوان کھڑکی سے جھانکے۔ لیکن بہت دیر تک انتظار کرلینے کے بعد وہ مایوس سی ہوگئی، نیا لباس اتار دیا اور میلی ساڑی پہن لی۔ اور جونہی میلی ساڑی پہن چکی تو وہ نوجوان سامنے کھڑکی میں نمودار ہوا۔ اختری نے یوں محسوس کیا جیسے اس کے ہاتھوں میں سے چینی کے برتنوں کا طشت چھوٹ کر فرش پر گر گیا ہے! سنگین بت کی طرح وہیں جم گئی۔ نوجوان کی نظریں سیدھی اس پر پڑیں۔ اور انھوں نے اختری کا کچھ اس انداز سے جائزہ لیا جیسے وہ بیوٹی کمپٹیشن کا سب سے بڑا جج ہے، اور اختری یوں ساکت و صامت کھڑی رہی جیسے آج ہی اس کی قسمت کا فیصلہ ہونیوالا ہے۔ گھبرائی ہوئی نیچے فرش پر نظریں جمائے رکھیں شانوں پر پڑے ہوئے بالوں کو سر کے ایک جھٹکے سے پیچھے کیا اور سامنے دیکھا تو نوجوان کھڑکی سے ہٹ چکا تھا۔ اسے اپنے آپ پر بہت

غصّہ آیا۔ ایک غیر مرد کے سامنے پگلوں کی طرح اپنے حسن کی نمائش کرنے کے لئے کھڑی رہی اور وہ غیر مرد اتنا بے نیاز۔ اتنا بدمذاق کہ اس نے توجہ ہی نہ کی۔ اختری نے محسوس کیا جیسے وہ اس گھناؤنی صورت والی گداگر چھوکری سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔ جو روزانہ نیچے گلی سے قدم قدم پر کوڑھ کے کیڑے گراتی گزر جاتی ہے۔

اس نے جی ہی جی میں فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اس طرف کبھی نہ دیکھے گی۔ کھڑکی بند کر دیتی۔ لیکن روشنی اور ہوا کا ایک ہی تو راستہ تھا بس وہ ادھر دیکھیں گے نہیں۔ یہیں پلنگ پر بیٹی ناول پڑھتی رہیگی لاہور کی سہیلیوں کو خط لکھتی رہے گی۔ سجّاد صاحب کے متعلق سوچتی رہے گی، بہرحال وہ ادھر توجہ نہ کرے گی۔

اور یہ تہیّہ کر کے وہ باورچیخانے میں گئی۔ بڑھیا کے پاس بلیٹھ کر چائے پی۔ دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی۔ پھر اپنے کمرے میں آکر لیمپ روشن کیا۔ نظریں جھکائیں پلنگ تک آئی اور خدا جانے کس طرح اس کی نظریں کھڑکی پر جا پڑیں۔ کھڑکی ہوا کے جھونکے سے بند ہو چکی تھی۔ یہ اچھا ہوا۔ اس نے سوچا ورنہ میں تو اپنے فیصلے سے انحراف کر چکی تھی، لیکن ایک آدھ گھنٹے کے بعد اسے ہوا کی ضرورت محسوس ہوئی جا کر کھڑکی کھولی تو وہ نوجوان باہر گلی میں جھانک رہا تھا۔ کھڑکی کھلنے کی آواز سُنی تو وہ پیچھے ہٹ کر ایک طرف گھوم گیا!

اور اختری سوچنے لگی کہ شاید یہ نوجوان شرماتا ہی اور ڈرتا ہی کہ

اگر میری طرف توجہ کر بیٹھا تو میں کہیں ہنگامہ نہ مچا دوں، لیکن مجھے تو وہ اچھا سیانا دکھائی دیتا ہے، کیا اس نے میری آنکھوں کی چمک اور میرے عارض کے رنگ نہیں دیکھے، کیا وہ سمجھتا ہے کہ میں کھڑکی کے پاس صرف ہوا خوری کے لئے آ کھڑی ہوتی ہوں، بیچارا کتنی غلطی پر ہے، اسے سمجھایا جائے، لیکن کس طریقے سے، اب میں کیسے آواز دوں، اور جب وہ کھڑکی میں آئے تو کیسے کہوں کہ تم ناحق ہچکچا رہے ہو، تم تو میرے — اسوچوں کے اس بڑھتے ہوئے دھارے کے سامنے اچانک کسی احساس نے بند باندھ دیا۔ آ کر پلنگ پر گر پڑی، اور روشنیوں اور تاریکیوں کو آپس میں گھلتے ملتے دیکھتی رہی۔ یوں نہیں۔ یوں۔ یوں بھی نہیں۔ یوں — نہیں نہیں یوں بھی ٹھیک نہیں۔ یوں۔!

لیکن وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچی۔ اور صبح اٹھ کر جب وہ لباس بدل رہی تھی تو اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ وقت سے بہت پہلے اسکول پہنچی۔ اسکول کی پرانی ملازمہ کو بلا کر ایک طرف لے گئی اور بولی۔ میں جب سے اس اسکول میں آئی ہوں۔ مجھے بڑی اماں۔ تمہارے سوا کسی سے دلچسپی نہیں۔ تمہاری میٹھی میٹھی باتیں اور تمہاری بزرگی۔ اور تمہاری مہربان صورت —— میں تو اس بھرے شہر میں صرف تمہیں کو اپنا سمجھتی ہوں۔ ورنہ یہ خشک استانیاں اور یہ گستاخ چھوکریاں — ان سے تو میرا جی بیزار ہو چکا ہے، تم اتنی اچھی ہو بڑی اماں کہ ——"

اور بڑھیا مسرت سے ہانپتی ہوئی بولی۔ لیکن بیٹی تو نے مجھے کبھی

کوئی خدمت بھی تو نہیں بتائی میری بزرگی اور میری باتیں تمہارے کس کام کی۔ تمہارے یہاں آنے سے پہلے یہاں ایک استانی آئی تھیں ——"

اختری گھبرا گئی۔ اب بڑھیا ایک ایسے قصّے کو چھیڑنے والی تھی جو شام پڑے تک بھی شاید ہی ختم ہوتا۔ جیب سے دس روپیوں کا ایک نوٹ نکال کر بولی، بڑی اماں اتنا بڑا کام میں تمہارے سوا اور کسی کے سپرد نہ کرتی۔ یہ لے اپنا انعام اور شام کو میرے پاس آئیو۔ میں تمہیں ایک خط لکھدوں گی اور وہ —" اختری کا سارا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا ہونٹ کانپنے لگے۔ اور کچھ کہنے کی کوشش اور کچھ کہہ نہ سکنے کے دُکھ سے اس کا رنگ اڑ گیا۔

بڑھیا مسکرا کر بولی۔ "لے بی بی۔ مجھ سے پردا کیا۔ بتاؤ! کون ہے؟ بس یہ سمجھو میرے سر پر سلیمانی ٹوپی ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ میں آج تک بھوسہ نہیں چھانتی پھری، یہاں سب نئی نئی استانیوں کے رقعے ——"

اور اختری کل کی طرح بول اٹھی۔ "وہ میرے گھر کے مقابل ایک ایک پرانا سا بالا خانہ ہے نا۔ وہاں ایک نوجوان رہتے ہیں۔ انھیں دے آئیو" "اچھا وہ شفیق!" بڑھیا ہنسی۔

شفیق! اور بڑھیا اسے جانتی بھی ہے حیران بھی ہوئی خوش بھی ہوئی۔ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا بھی محسوس کرنے لگی۔ اسکول کے چھ گھنٹے اسکے سینہ پر کابوس کی طرح سوار رہے۔ آخری گھنٹی بجی تو لپک کر گھر آئی۔ بہت سے

خط لکھے اور پھاڑ کر وہ پھینکے۔ اور آخر وہ صرف یہ دو سطریں ہی لکھ سکی۔

حضرت!

پڑوسیوں کے ایک دوسرے پر جو حقوق ہوتے ہیں اُن سے تو آپ ناواقف نہیں ہوں گے، آج رات کا کھانا میرے ہاں تناول فرمائیے گا۔ اختری

خط لکھ چکی تو اسکول کی بوڑھی ملازمہ آ پہنچی۔ اسے لفافہ دیا۔ اور پھر کھڑکی کے پاس آ کر بیٹھ گئی، دل یوں دھڑکنے لگا جیسے اسے کسی نجومی نے زلزلے کی اطلاع دے دی ہے اور وہ کائنات کے کروٹ بدلنے کی منتظر ہے۔ جسم تپ گیا۔ آنکھوں کے ڈوروں میں جلن سی ہونے لگی۔ سامنے کھڑکی سے اسے بڑھیا کے سلیپر گھسیٹنے کی آواز آئی۔ دس بارہ منٹ تک خاموشی رہی۔ اور پھر سلیپروں کی آواز آئی۔ وہ تیزی سے پلنگ پر بیٹھ کر میری کوریلی کا ناول پڑھنے لگی۔ اور جب اس مغموم لڑکی نے اس نوجوان کو ــــ! بڑھیا نے اسی کا لفافہ سامنے میز پر رکھ دیا۔

جواب ہی نہیں دیا؟" اختری نے پوچھا۔

اور بڑھیا بولی "اری بی بی۔ تو اتنا گھبرا کیوں رہی ہے۔ تیرے خط کے پیچھے ہی کچھ لکھ دیا ہے اس نے لفافہ تو کھول۔"

اختری نے لفافہ کھولا۔ آنکھوں کے سامنے ایک بحرِ ذخار سا لہریں لینے لگا اور پھر ان اچھلتی اور لپکتی ہوئی لہروں میں سے یہ دو سطریں اُبھریں۔

محترمہ!

میں دودھ کا جلا ہوں اور اب چھاچھ کو پھونک کر پینے کے بجائے اسے چھوتا تک نہیں۔ شکریہ! شفیق

اختری خط پڑھ چکی تو بڑھیا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور بولی "کل پھر اس وقت؟ مبارک ہو بی بی۔ شفیق بڑا اچھا چھوکرا ہے۔ میں اس کی پرانی خدمت گار ہوں۔"

بڑھیا چلی گئی۔ تو اختری بہت دیر تک سامنے دیوار پر نظریں گاڑے بت کی طرح بیٹھی رہی۔ اور پھر اچانک بگولے کی طرح ابھر کر ایک کاغذ کھینچا اور اس پر کچھ لکھنا ہی چاہتی تھی کہ سامنے بالاخانے کی کھڑکی کھڑاک سے بند ہونے کی آواز آئی۔ وہ لپک کر کھڑکی تک گئی۔ نیچے گلی میں جھانکا تو وہی نوجوان ہاتھ میں بستر لٹکائے اور کاندھے پر ایک بکس دھرے سیڑھیاں اترا اور پھر ہولے ہولے چلتا ایک اور گلی میں مڑ گیا۔ اختری نے یوں محسوس کیا جیسے کسی نے اسے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا ہے، دیوانوں کی طرح قلم کی تلاش میں سارا کمرہ چھان مارا اور آخر اسے قلم اپنے ہاتھ ہی میں مل گیا۔ میز پر جھک گئی کچھ لکھا۔ بڑھیا کو آواز دی، وہ بھاگی بھاگی آئی۔ تو اس کے ہاتھ میں ایک خط دیتے ہوئے بولی۔ "یہ جا کر ڈاک خانے ڈال آ۔ جلدی۔"

"گھر بھیج رہی ہو بی بی؟" بڑھیا نے پوچھا۔ "میرے سلام لکھ دیئے ہیں بڑی بی بی جی کو؟"

"یہ میرا استعفیٰ ہے" اختری بولی۔

"استعفیٰ، بی بی؟" بڑھیا کی دھندلی آنکھیں پھیل گئیں۔

"کیوں؟"

"میں یہاں لڑکیوں کو پڑھانے اور سکھانے آئی تھی"۔ اختری بولی۔ "لیکن مجھے ابھی خود ہی بہت کچھ پڑھنا اور سیکھنا ہے۔ خط ڈال آؤ اور پھر آکر اس کھڑکی کو بند کر کے اس میں میخیں گاڑ دو، کہ پھر کھل نہ سکے۔ میں آجکل تازہ ہوا سے گھبراتی ہوں"——

اور اس نے میری کوریلی کا ناول اٹھا لیا۔

# ادھورا گیت

پھٹی ہوئی اوڑھنی ایک کیل سے لٹکا کر جب سیماں کھاٹ پر لیٹی، تو اسے اندھیرے میں اچانک اُجالے کا ایک دائرہ سا ابھرتا دکھائی دیا! اور اُس اُجالے کے قوسی خط پر اسے بہت سی پرچھائیاں تیرتی نظر آئیں ـــــ گاؤں کے نوجوانوں کی پرچھائیاں جن کے لمبے لمبے بال تھے مُسکراتے ہوئے چہرے تھے، اور کانوں میں سونے کی مرکیاں تھیں یہ پرچھائیاں کبھی سمٹ کر دور نکل جاتیں، کبھی لپک کر قریب آجاتیں، اور ایک پرچھائی تو ہولے ہولے سرکتی سیماں کے پاس آگئی، اور اس کے گال چھو لئے۔ گھبرا کر اس نے اپنے گال پر ایک ہلکا سا طمانچہ لگا دیا۔ اور پھر جب اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، تو چاروں طرف اندھیرا چھا رہا تھا۔ صحن میں بیری کا درخت دم بخود کھڑا تھا اور گھڑوں کے قریب ایک سوراخ میں ٹڈا چلّا رہا تھا ـــــ جاگتے میں خواب دیکھنا سیماں کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی اور ان خوابوں پر گاؤں کے بانکے نوجوانوں کی پرچھائیاں چھائی رہتی تھیں ـــــ مُسکراتے ہوئے چہروں اور تڑپتی ہوئی مرکیوں والے البیلے گبرو!۔۔۔ اُسے کبھی اپنے مرحوم باپ کا خواب سوتے میں بھی نہ دکھائی دیا، جو

چھ ماہ ہوئے قحط اور بڑھاپے کا شکار ہو چکے تھے!

وہ اس کوٹھڑی میں اکیلی رہتی تھی، دن بھر کھاتے پیتے گھروں کے لئے چکی پیستی اور شام پڑے دو لقمے زہر مار کر کے کھاٹ پر دراز ہو جاتی پانی بھرنے جاتی تو چھوکریوں سے بچتی بچاتی، اور کتراتی —— اور جو کسی لڑکی کی آنکھوں سے آنکھیں مل جاتیں تو وہ قہقہے بلند ہوتے، کہ وہ آدھی گاگر ہی پر اکتفا کر کے گھر لوٹ آتی۔

اس کے گھر کے چھوٹے سے آنگن میں بیری کا لمبوترا سا درخت مرے ہوئے دیو کے سوکھے ڈھنچر کی طرح ایستادہ تھا۔ جس پر نہ کبھی سبز طوطے آکر بیٹھے، اور نہ شوخ ممولے، بلکہ بھولے بھٹکے کوے اور بھوکی پیاسی چیلیں بے جان پھڑ پھڑاتی، سوکھی ڈراؤنی شاخوں سے ٹکراتی۔ اس کے تنے سے چمٹ جاتیں، اور پھر کوئی عجیب سی بولی بول کر اڑتیں، اور اندھیرے میں ان کے خوفناک سائے دیر تک منڈلاتے رہتے۔ گاگروں کے قریب جہاں دیوار میں ایک سوراخ تھا۔ آدھی رات کو ایک ٹڈا ہیں ہیں پکار اٹھتا، سیماں کی آنکھ کھل جاتی اور ٹڈے کی مسلسل کھردری ہیں ہیں سے تنگ آکر جب وہ سوراخ پر اپنا بوسیدہ جوتا پٹختی، تو اسے اچانک یوں محسوس ہوتا جیسے اس مظلوم ٹڈے کا وجود پھولنے اور پھیلنے لگا ہے اور وہ اپنی بے ڈھنگی ٹانگیں گھما گھما کر چلتا ہوا اس کا گلا دبوچنے کے لئے بڑھا آ رہا ہے دراصل اسے ہر چیز سے ڈر لگتا تھا! اندھیرے میں گاگریں دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوتا، جیسے بیشمار بونے اس کی تاک میں بیٹھے چھریاں تیز

کر رہے ہیں، چھت کی منڈیریں اکثر ابھرنے لگتیں حتی کہ آسمانوں میں دھنس جاتیں اور پھر سیماں کے کانوں میں اس شدت کی گرج سنائی دیتی، کہ وہ چیتھڑوں بھرے بستر پر سمٹ کر گٹھڑی بن جاتی اور جب گھبرا کر آنکھیں کھولتی، تو منڈیروں پر اُسے کئی اچھوتے سائے کلیلیں کرتی نظر آتے۔ زندگی کے متعلق اس نے اپنی سمجھ کے مطابق کئی بار سوچا اور وہ اس نتیجے پر پہنچی، کہ زندگی سوت کی انٹی ہے، احتیاط سے دھاگا اتارو تو طویل ہوگی، ورنہ ہر لمحہ باریک تار ٹوٹنے کا احتمال ہے۔ اور وہ اکثر حیران ہوا کرتی تھی کہ اس کی زندگی کا تار کیوں نہیں ٹوٹتا۔ جب کہ فاقوں کے فولادی اور نکیلے پنجوں نے کئی بار اُس کی سانسوں کے تانے بانے کو الجھا سا دیا تھا

چکی کی گھمر گھمر میں وہ اکثر اس حد تک کھو جاتی، کہ اناج ختم ہو جاتا اور خالی چکی کی بھیانک گھسر پھسر سے محلے والیاں چونک اٹھتیں اور ناکوں پر انگلیاں رکھے، گردنیں ایک طرف جھکائے، پتلیاں نچاتی، جب سیماں کے پاس آتیں، تو دیکھتیں کہ گو اس کی آنکھیں کھلی ہیں لیکن وہ سو رہی ہے، اُسکی نظریں سامنے دیوار کے کسی موہوم نقطے پر پیوست ہیں، اُس کا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا ہے اور چکی اس تیزی سے گھوم رہی ہے کہ نور ے درزی کی مشین کی ہتھی بھی کیا گھومتی ہوگی۔ "ہے سیماں" کہہ کر سب کی سب اس پر ٹوٹ پڑتیں اور جب وہ دیکھتی کہ آٹا تو کب کا پس چکا اور وہ خالی چکی گھمائے جا رہی ہے، تو لرز جاتی، شرمندہ ہو کر آٹا سمیٹنے لگتی۔ محلہ والیاں دوپٹوں میں ناکیں چھپا چھپا کر ہنستیں اور چکی کی مالکن باہیں پھیلا پھیلا کر اُسی

کوسنے دیتی، کل ہی تو تیرے باپ بنّو لوہار نے چکی پر دن بھر ہتوڑے چلائے! آج پھر دونوں پاٹوں کو رگڑے جا رہی ہے۔ اب اتنے گھسے ہوئے پاٹوں میں اناج خاک پسے گا! یہاں بیٹھی خواب دیکھا کرتی ہے اپنے ہوتوں سوتوں کے ارانڈ کہیں کی، اب جا۔ کوئی اور چکّی والا گھر تلاش کر۔"

اور سیماں اور کوئی چکی والا گھر تلاش کر لیتی۔ لیکن یہ خواب —— یہ ان ہونے خواب وہاں بھی آ دھمکتے، اور سامنے بھوری دیواروں پر ایسے نقوش ابھارتے کہ اناج ختم ہو جاتا، اور چکی کی گھمر گھمر کھسر پھسر میں تبدیل ہو جاتی!

ایک بار تو اس نے ارادہ کیا کہ اپنی کمائی سے پیسہ پیسہ اکٹھا کر کے اپنی نئی چکی خرید لے لیکن یہ سن کر وہ بے حد متعجب ہوئی کہ چکی کے پتھر جنگ کی وجہ سے بہت مہنگے ہو گئے ہیں۔ اور آج کل سرکار نے پتھروں پر بھی ٹیکس لگا رکھا ہے!

پھٹے پرانے گودڑوں کو دن بھر دھوتی رہتی۔ پسینے اور دھول سے سنے ہوئے یہ چیتھڑے جب بدبو اور میل اگلتے، اور دیسی صابن کا جھاگ خواب آلود آواز میں سوکھنے لگتا، تو وہ ایک چادر میں لپٹی ہوئی انھیں ان ہونے خوابوں میں ڈوب جاتی، کائنات چپ سادھ لیتی۔ ہوائیں تھم جاتیں سائے جم جاتے اور سیماں کے گرد آلود دماغ میں سوت کی انٹیاں اور نازک تار گھومنے اور پھیلنے لگتا، نیم وا ہونٹوں میں ایک غیر محسوس سی لرزش پیدا ہوتی ابروؤں کی کمانیں جھک آتیں، آنکھوں کی گہرائیاں اندھیری ہو جاتیں۔ اور وہ سوچتی رہتی، کہ سب کیا ہے، اور کیوں ہے! اور کب تک رہے گا، کیا اور کیوں

اور کب کا یہ طوفان لمحہ بہ لمحہ زور پکڑنے لگتا اور وہ چیتھڑوں کو کھردری پتھروں پر اس زور سے مروڑتی کہ وہ چھر رچھر رپھٹ کر چیخنے لگتے اور پھر جب وہ خشک ہو جاتے، تو وہ ایک زنگ آلود سوئی لے کر بیٹھ جاتی، اور تب تک یہ چاک سیتی رہتی، جب آسمان کی دھندلاہٹوں میں سفید سفید چنگاریاں سی بکھر جاتیں اور چیلوں اور کوّوں کے لمبے لمبے مبہم سائے فضاؤں میں سرسرانے لگتے۔

وہ ایک دوپہر کو اپنے چیتھڑے دیوار پر پھیلا رہی تھی کہ اسے گلی میں لوگوں کا شور سنائی دیا، اور چونکہ وہ ہر بات میں دلچسپی پیدا کر کے اپنا من پرچانے کی دھن میں رہتی تھی، اس لئے الٹا سیدھا چولا پہن کر بھاگی، اور دیکھا کہ گلی میں بہت بھیڑ ہے، بوڑھے، جوان اور بچے ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں، ڈھول بج رہا ہے، شہنائیاں گونج رہی ہیں، اور چھتوں پر نوجوان لڑکیاں پھولوں کی جھولیاں بھرے کھڑی ہیں۔ وہ کسی سے یہ نہ پوچھ سکی، کہ آج کونسا تہوار ہے، کیونکہ اسے یقین تھا کہ لوگ اس پر ہنس دیں گے، کئی بار عیدیں آئیں اور گزر گئیں، اور پھر کئی روز بعد اسے معلوم ہوا کہ عید بھی آئی تھی، لوگوں نے بھڑکیلے کپڑے بھی پہنے تھے مرغن کھانے بھی پکے تھے، مولوی جی نے پرانی کالی مسجد کے ممبر پر کھڑے ہو کر غریبوں اور بیکسوں کی امداد کرنے کی درخواست بھی کی تھی۔ اور پھر اس کے بعد خود جھولی پھیلا کر قرآن مجید کی آیات اس رقت سے پڑھی تھیں، کہ لوگوں کے نئے کپڑے آنسوؤں سے بھیگ گئے تھے، خدا جانے کیا بات تھی کہ عید سے کئی روز پہلے اور عید سے کئی دن بعد

وہ گوشہ نشین سی ہو جاتی اور پھر جب گھر سے نکلتی، تو عیدیں گزر چکی ہوتیں اور گوری ہتیلیوں پر مہندی کے رنگ پھیکے پڑ چکے ہوتے!

اچانک گلی کے تنگ موڑ پر ایک شخص ایک انبوہ میں گھرا ہوا نمودار ہوا، قدم قدم پر مسکراتا ہوا خوبصورت اجنبی! لمبے لمبے بالوں اور ننھی ننھی سنہری مونچھوں والا البیلا نوجوان —— سیماں کسی سوچ میں پڑ گئی! —— چھتوں پر سے سرسوں کے پھولوں کی بارش ہونے لگی فضا میں پیلے پیلے تارے سے بکھر گئے، اور ان میں اس اجنبی کا چاند سا چہرہ بہت بھلا معلوم ہونے لگا۔ سیماں کے دل میں ایک الجھن سی پیدا ہوئی، اُس کا جی چاہا، کہ وہ بھی کچھ تو اس اجنبی کے نذر کرے جس کی ہر حرکت پر گاؤں والے قربان ہو رہے تھے، اور جب وہ اجنبی اُس کے قریب آیا، تو وہ گھبرا سی گئی، ہاتھ بڑھایا مگر جیتھڑے میں الجھ گیا، بے قرار ہو کر ہاتھ کو جھٹکا دیا، اور نئے ٹانکے ٹوٹ کر بکھر گئے، لپک کر سرسوں کا ایک پھول خاک پر سے اٹھایا، اور نوجوان اجنبی پر نچھاور کرنے کے لئے اٹھی۔ تو کائنات کے دور دراز کونوں سے نقرئی گھنگھروں کی جھنجھناہٹیں بلند ہوئیں، اور ہوائیں دھوئیں کے سے بل کھاتی اسکے دل و دماغ میں تڑپنے لگیں، نوجوان ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ اوپر اٹھا کر سیماں نے سرسوں کا پھول ہوا میں اچھال دیا، پھول نوجوان کی سنہری مونچھوں میں اٹک گیا، مسکرا کر وہ پھول اس نے جیب میں ڈال لیا اور پھر ہمراہیوں سے کچھ کہتا آگے بڑھ گیا۔ اس کی

آواز ڈھولوں، شہنائیوں اور لوگوں کی مسرت بھری چیخوں میں ڈوب گئی وہ کچھ نہ سن سکی۔ مگر اسے اتنا ضرور محسوس ہوا کہ نوجوان نے اس کا مذاق اڑایا ہے!

لیکن وہ تھا کون؟

وہ بیقرار سی ہو گئی اور ہمت باندھ کر ایک بڑھیا سے پوچھ ہی لیا۔ "خالہ یہ شخص کون ہے؟"

اور بڑھیا ناک بھوں چڑھا کر بولی۔ "تو جا کر گھر میں خوابیں دیکھ، خوابیں۔ تو اتنا بھی نہیں جانتی کہ ہمارے گاؤں میں، ملک پنجاب کا اتنا بڑا شاعر آیا ہے، ایسے ایسے گیت اور دوہے بناتا ہے کہ ولایت والے بھی جھوم جھوم جاتے ہیں!"

"اچھا، تو بہت بڑا آدمی ہے یہ اجنبی!" سماں، نے اپنے جی میں کہا، اور ہولے ہولے قدم اٹھاتی گھر آ گئی، اس کے جی میں امنگ اٹھی کہ وہ بھی کوئی گیت کہے، آخر یہ کیا بات ہے، کہ دنیا کے سب لوگ گیت نہیں کہہ سکتے، حالانکہ گیت عام باتوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتے بہت دیر تک سوچتی رہی، کہ وہ گیت کیسے کہے، اور اس گیت میں کونسی بات کہے، اور پھر اسے کیسے گائے اور کسے سنائے!

نصف شب کو اچانک گاگروں کے قریب سوراخ میں ٹڈا چیخا۔ اس نے جوتا اٹھایا اور گھما کر ٹڈے پر پھینکنے ہی والی تھی، کہ اس کا ہاتھ رک گیا، ٹڈے کی بیں بیں میں اسے ایسے سریلے بول سنائی دینے لگے

جو اس نے اس سے قبل کبھی نہیں سنے تھے۔ دور آسمان کے گنبد میں ستارے لٹک رہے تھے، بیری کا بوڑھا درخت طوبیٰ کی شکل اختیار کر گیا تھا، منحنی دیواروں پر اُسے الف لیلوی شہزادیوں کے محلوں کا گمان ہونے لگا وہ بستر پر کروٹیں بدلنے لگی اور جسم و جان کی اس خلش آمیز بے چینی میں اسے ایک ایسی لذت محسوس ہوئی کہ اس کے ہونٹ مسکرانے کی جراٴت بھی کرنے لگے۔ وہ مسکرائی اور یونہی وارفتگی میں کچھ گنگنانے لگی۔

نانا نانا نن نن نانا نن نن نا نا نا نا

اُس کی آنکھوں پر پپوٹے جھک آئے، اور اس رسیلی "نانانانا" کی دھندلاہٹوں میں سے ایک رکار کا گیت ابھرا۔

مجھ سے پیت نہ کرنا

بانکے،

مجھ سے پیت نہ کرنا

"پیت؟" اچانک اس نے اپنے آپ سے پوچھا، اور پھر اپنے منہ پر ہلکا سا طمانچہ مار کر بولی "پگلی!"

لیکن گیت کے ابتدائی بول ڈھل چکے تھے، اور "پیت" کا لطیف لفظ اس کے دل و دماغ میں تیر چکا تھا!

"کیسی پیت؟ کس کی پیت؟" اس نے پھر گھبرا کر اپنے آپ سے پوچھا، کوئی جواب نہ پا کر وہ پھر تیزی سے کروٹیں بدلنے لگی، اس کے بال کھاٹ سے نیچے لٹک کر زمین کو چھونے لگے اور اس کا لباس

بستر کے گودڑ میں خلط ملط ہو گیا۔ وہ پھر گنگنانے لگی۔

نا نا نا نا نن نن نا نا نن نن نا نا نا نا

مجھ سے پیت نہ کرنا

بانکے

مجھ سے پیت نہ کرنا

اور پھر آپ ہی آپ :-

میں دکھیاری، غم کی ماری،

مجھ سے پیت نہ کرنا!

"گیت بن رہا ہے!" اس نے اپنے آپ سے سرگوشی کی، آپ ہی آپ بنے جا رہا ہے۔ مجھ سے پیت نہ کرنا بانکے ___ پر پیت کیسی، بانکا کون؟"

وہ گھبرا گئی، اس نے چاہا اٹھ کر کوئی کام کرے، تاکہ یہ پیت اور یہ بانکپن کی باتیں اس کے دماغ سے بھاگ جائیں، وہ اندر سے چھاج اٹھا لائی اور خالی چھاج پٹخنے لگی لیکن چھاج کی "پٹخ، پٹخ، پٹخ -" نے اُسے پھر کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا، اور وہ گنگنانے لگی!

مجھ سے پیت نہ کرنا،

بانکے

مجھ سے پیت نہ کرنا!

یہ باسی مرجھائی کلیاں، یہ آشائیں میری

بھول کے بھی ان پر نہ پڑیں گی مست نگاہیں تیری

دم نہ وفا کا بھرنا،
بانکے
مجھ سے پیت نہ کرنا!

مسرت آمیز تعجب نے اُس کی سانسیں اُلجھا دیں، اُس نے چھاج پرے پٹخ دیا، اور پھر اس بند کو کئی بار گنگنایا، کھاٹ پر لیٹ کر چٹکی بجانے لگی اور یہ بند کئی بار الاپا، بہت دیر بعد وہ یونہی گیت گنگناتی، چٹکی بجاتی، سو گئی —— اور جب اٹھی تو گھناؤنی بیری کے کالے تنے سے کوّے اور چیلیں لپٹی ہوئی تھیں اور اس کے مکان کی چھت پر ایک بلّی اپنا بچہ منہ میں اٹھائے بھاگی جا رہی تھی اُسے یہ ساری کائنات ایک رس بھرا سپنا معلوم ہونے لگی لیکن گیت کا وہ بند اسے ازبر تھا، اور خوابوں کی باتیں یوں ازبر نہیں ہوا کرتیں!

اس روز گاؤں سے باہر ایک کھلی چراگاہ میں گاؤں والے اکٹھے ہوئے، سرسوں کے پھولوں کا ایک تخت بنایا گیا جو چراگاہ کے عین درمیان تھا۔ تمام علاقے سے لوگ جوق در جوق آنے لگے اور جب ڈھول بجنا شروع ہوا، تو عورتیں بھی خاموش سرسراہٹیں پیدا کرتیں چراگاہ کو جانے لگیں۔ سیماں اپنے مکان کی چھت پر سے سب کچھ دیکھ رہی تھی، جب سارا گاؤں خالی ہو گیا تو وہ باہر گلی میں آئی، دیواروں سے لگتی ہٹتی، ہچکچاتی چراگاہ کی طرف بڑھی، اور جب سامنے دیکھا تو میداں لوگوں سے پٹا پڑا تھا۔ شاعر سرسوں کے تخت پر سے اٹھ رہا تھا۔ اُس نے ادھر اُدھر

نظریں دوڑائیں۔ اور پھر ایک جگہ آکر رک گئیں۔ سیماں کو محسوس ہوا کہ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا ہے چراگاہ کے کنارے پر سیماں کے سوا کوئی اور موجود نہ تھا، سیماں کے جی میں آئی کہ واپس چلی جائے، بھاگ جائے وہاں سے اور اپنے سنسان گھر میں خوفناک بیری کے تنے کا سہارا لیکر اپنی خیالی دنیاؤں میں کھو جائے کیونکہ وہ محسوس کر رہی تھی کہ شاعر اس کی طرف دیکھے جا رہا ہے، اس نے چیتھڑوں سے جھلکتے ہوئے اپنے جسم کو ڈھانپنے کی کوشش کی، ایک بار پلٹی بھی! لیکن سب یقینوں کو وہم پر محمول کر کے وہ چراگاہ کی طرف بڑھی اور جب عورتوں کے جھمگٹ میں پہونچی، تو دوشیزائیں اُسے تعجب سے گھورنے اور سرگوشیاں کرنے لگیں۔

"اری! سیماں بھی گیت سننے آئی ہے! یہ بھلا کیا سمجھے گی۔ یہ باتیں! چکّی پیسنے والی کو گیتوں سے کیا لگاؤ!" — سیماں نے ان کی سرگوشیاں سن لیں اور اُس کے چاروں طرف رات کا گیت گونج اٹھا۔ لیکن وہ ان نادان لڑکیوں کو کیسے سمجھاتی، کہ گیت سمجھنا تو ایک طرف رہا، وہ تو گیت کہتی بھی ہے! اور پھر اس کے گیت میں "بیت" اور کسی "نامعلوم بانکے" کا ذکر تھا، اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ صرف ان کی بیتیں چھپی رہ سکتی ہیں، جس کے پاس پیسہ ہو، اس لئے وہ ان سرگوشیوں سے کان پھیر کر شاعر کی طرف متوجہ ہوئی، تمام مجمع پر سکوت طاری تھا۔ سورج کی زرد زرد کرنیں آس پاس نیم اور شیشم کے درختوں کی جھولتی ہوئی شاخوں پر کھیل رہی تھیں، اور چڑیوں کے غول چرچراتے ہوئے چراگاہ پر سے گزر رہے تھے۔

شاعر نے اِدھر اُدھر دیکھا، اور پھر ایک گیت گایا جس کا مفہوم یہ تھا:-

اے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی نادان حسینہ! تو نہیں
جانتی کہ تیری روح کی گہرائیوں میں کائنات کے
مقدس راز پوشیدہ ہیں!
تو نہیں سمجھتی کہ تیری مرگ کی سی خوبصورت آنکھوں
میں آفاق کا دل دھڑک رہا ہے! تو نہیں جانتی
کہ وقت کے قدم تیری معطّر سانسوں کے زیر و بم سے
ہم آہنگ ہو کر اُٹھتے ہیں! اور تو نہیں سمجھتی کہ تیری
پریشان کاکلوں کی پُراسرار ظلمتوں میں کیسے کیسے
فردوسی چراغ ٹمٹما رہے ہیں!
تو سب سے الگ کیوں کھڑی ہے؟ تو دیر سے
کیوں آئی ہے؟ تو کس سوچ میں ہے انجان حسینہ!
تو مجھ سے کتراتی نہیں، بلکہ میری راتوں پر اپنی
مسکراہٹوں کا حُسن برسا! اور جان لے۔ کہ
جو کچھ میں نے تجھ میں دیکھا، وہ کوئی دوسرا
نہیں دیکھ سکتا!
اے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی نادان ساحرہ!

دم بخود دہقان جو یہ گیت صرف اس لئے سن رہے تھے کہ وہ اُن کے محبوب شاعر کی زبان سے نکل رہا تھا گیت ختم ہوتے ہی پہلو بدلنے لگے،

اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور ہونٹ کپکپا رہے تھے اور گو وہ یہ گیت نہ سمجھ سکے، لیکن یہی کیا کم تھا، کہ گیت گانے والے کے چہرے کے ارد گرد ایک زریں ہالہ نمودار ہو رہا تھا، اُس کی آواز کی کروٹیں زرد کرنوں سے دُھلے ہوئے خلاؤں میں عنبر اور لوبان کے خوشبودار دھوئیں کی طرح مست مست پلٹے کھا رہی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ کائنات کا نظام صرف یہ گیت سننے کو لمحہ بھر کے لئے تھم گیا ہے!

سیماں کو شک گزرا کہ شاعر نے صرف اُسے مخاطب کیا ہے۔ آخر یہ "چھیتھڑے" اور "دیر سے آنا" اور "اُنجان حسینہ" اس کے گیت میں آپی آپ کیسے آ گئے، لیکن پھر وہ سوچنے لگی کہ گیت رات کی رات نہیں بنائے جا سکتے، اور وہ خیالی بہشت میں اڑی پھر رہی ہے۔

اس کے بعد شاعر نے اپنی نقرئی آواز میں کئی گیت گائے "ایک صحرا میں ایک اکیلا دکیلا پھول تھا" — اور "ایک پہاڑی پر ایک کونج رہا کرتی تھی جس کا ایک پر ٹوٹا ہوا تھا" — اور "مسکراؤ نہیں اے شریر ستارو — مسکراؤ نہیں!" — اور خدا جانے کیسے کیسے گیت، مگر جلد ہی سیماں کا دل بھر آیا۔ اُس کے دماغ میں جھکڑ سے چلنے لگے، شاعر کے گیتوں نے اُس کے احساسات کے ارد گرد اک آگ سی روشن کر دی اور اس کی آنچ سے اس کا سارا جسم دہکنے لگا۔ گیت ختم ہونے سے پہلے ہی وہ چراگاہ سے بھاگ آئی، اور جب گاؤں میں داخل ہوئی تو ہوا کا ایک آوارہ جھونکا چراگاہ سے شاعر کا یہ سُریلا بول اڑا لایا "اسے اکیلا

رہنے دو۔ کیونکہ حسن خلوتوں میں اپنے پورے جوبن پر ہوتا ہے!" وہ سوچنے لگی، کہ شاعر کی ہر بات میں اُس کی طرف یہ اشارے کیسے چھپے ہوئے ہیں اور یہ کیا راز ہے کہ شاعر گیت گاتے ہوئے صرف اسے دیکھ رہا تھا اور وہ سرسوں کا ایک ہی پھول اور پھر وہ تبسم بھرا چہرا! کھاٹ پر گری، تو اس کے آس پاس گھنٹیاں سی ٹنٹنانے لگیں۔ ٹنا ٹنا ٹن! ٹنا ٹنا ٹن! اور اُس نے پھر وہی گیت الاپنا شروع کر دیا۔

مجھ سے پیت نہ کرنا

بانکے

مجھ سے پیت نہ کرنا

اُس روز جب وہ ایک زمیندار کے گھر چکی پیسنے گئی، تو مغربی افق غبار آلود ہو رہا تھا، اور فضا پر ایک منتظر سا سکون طاری تھا، جیسے کوئی غیر معمولی بات ہونے والی ہو، ایک بار وہ پانی پینے کے لئے چکی والے کمرے سے باہر آئی، تو آسمان پر ابر گھر آیا تھا، اور صحن میں نیم کی جھکی ہوئی شاخیں تیز ہوا کی وجہ سے کمانیں بن کر آسمان کی طرف اٹھ اٹھ جاتی تھیں شام قریب آ چکی تھی، اور اسکی چنگیر میں ابھی تھوڑی سی گندم باقی تھی، لیکن وہ اندر گئی، ہتھی کو مضبوطی سے تھام کر پاٹوں کو اس شدت سے چکرایا کہ آٹا سفید غبار سا بن کر اس کے ارد گرد اڑنے لگا اور اُس کے بالوں کی تابانیاں سنولاسی ہو گئیں وہ اب خواب دیکھنے کے اس دور میں پہنچ چکی تھی جب چکی کی گھم گھم کوئی اور تان چھیڑ دیتی تھی کہ اُسے باہر

زمیندار کی بہو بیٹیاں باتیں کرتی دکھائی دیں۔

سیمان نے چکی روک لی!

"ارّی۔ اس نے تو ابھی تک شادی بھی نہیں کی۔ عورت کی طرف دیکھنا بھی پاپ سمجھتا ہے وہ۔ بس گیت کہتا ہے اور مگن رہتا ہے!"

"شعر کہنا اور مگن رہنا اور بات ہے پر بی بی۔ اُس کی آنکھیں بڑی خطرناک ہیں، کبھی کبھی پلکیں اٹھاتا ہے، تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے برسوں کا بھوکا ہے!"

"اوئی۔ کیسی کھلی بات کہہ دی! کوئی سن پائے تو کیا کہے، چراگاہ میں آج جب اس نے گیت گائے تو اس کے چہرے پر کیسا نور آگیا تھا! اُس کے ہاتھ یوں ہلتے تھے، جیسے —— جیسے وہ ستاروں کو حکم دے رہا ہے، کہ زمین پر اتر آئیں، اور خاک کے ذرّوں کو کہہ رہا ہے کہ وہ اوپر اڑ کر آسمانوں کو دھندلا دیں!"

چار کتابیں کیا پڑھ لیں، سارے جہان کا علم ہضم کر ڈالا۔ انسان، اور تاروں پر حکم چلائے، عقل کے ناخن لو۔"

"پر وہ رہتا کس کے گھر ہے؟"

"گاؤں کے پورب میں جو اجڑا سا ٹیلا ہے نا۔ اس کے ورے تم نے ایک کھنڈر سا دیکھا ہوگا، جہاں اُس روز الّو بولا تھا۔ اور تم نے کہا تھا، یہاں کوئی آفت ٹوٹے گی۔"

"کہاں؟"

"اُدھر، وہ نالے کے اس طرف گارے سے بھوپا ہوا گھروندا جس کا گارا کب کا گر چکا ہے، اور اب پتھروں کا انبار دکھتا ہے دور سے!"

"ہاں ہاں"

"بس وہیں ۔۔۔ کہتے ہیں وہ اجاڑ جگہ رہنا زیادہ پسند کرتا ہے، اور کہتا ہے اسے لالٹین والٹین کی بھی ضرورت نہیں۔ مٹی کا میلا سا دیا ہو، اور بس ۔۔۔ وہ رات بھر گیت بناتا رہے گا۔ اور پھر آج تو ابر بھی گھر آیا ہے، کہتے ہیں یہ گیت بنانے والے بوندیاں پڑتے ہی قلم اٹھا لیتے ہیں، اور ساری ساری رات ۔۔۔ ارے! یہ تو بوندیاں گرنے لگیں!"

اندر سیماں کے تپتے ہوئے دماغ پر جیسے کسی نے خنک پھوار کی ایک مٹھی چھڑک دی۔ "اچھا تو ٹیلے کی پرلی طرف کا کھنڈر جہاں اُلّو بولتے ہیں ۔۔۔ وہاں رہتا ہے یہ عجیب و غریب شاعر یہ انوکھا اجنبی!"

آٹا دیتی، دو پیسے لیتی وہ گھر کی طرف لپکی۔ گھر آنے تک بھیگ گئی، جیکٹ چولا جسم سے چمٹ گیا، میلا لہنگا ہر قدم پر چپڑ چپڑ بجنے لگا گھر آکر اس نے پرسوں کی خریدی ہوئی کھجور کھائی اور کواڑ کھول کر دیر تک آسمان کی طرف دیکھتی رہی، باہر مینہ کے جھالے پڑ رہے تھے صحن میں بیری کے درخت کا پنجر دم بخود کھڑا تھا اوٹ پٹانگ بیوقت بول رہا تھا!

"ٹیلے سے پرے، جہاں اُلّو بولتے ہیں!"

اُس کے کان میں سرگوشی ہوئی۔ اور وہ کواڑ بند کرنا بھول گئی

گلی سے نکل کر گاؤں کے باہر آگئی، ہوا بہت تیز تھی. بجلی کی چمک سے سنسناتا ہوا اندھیرا جونہی غائب ہوتا، تو وہ سمٹ کر بیٹھ جاتی، اور یونہی گرتی پڑتی جب وہ ایک بار بجلی کی چمک سے ڈر کر دبک گئی، تو اس کی مٹھیوں میں ریت بھر گیا۔ "ٹیلا" اس نے زیر لب یہ لفظ کچھ ایسی شدت سے کہا کہ اگر خاموشی ہوتی تو گاؤں کے کتے اس پھنکار سے بھڑک اٹھتے جب وہ ٹیلے پر چڑھی، تو اس کا لباس بری طرح پھڑپھڑانے لگا، اس کے بال اس کی گردن سے چمٹ گئے۔ اور اس کا دل اس تیزی سے دھڑکنے لگا، جیسے سارا ٹیلا ناچ رہا ہے!

کھنڈر میں سے مدھم مدھم روشنی باہر آ رہی تھی۔ وہ ہولے ہولے کھسکتی کھنڈر تک پہنچی، اور جب اس کی دیوار کو چھوا تو اسے یوں محسوس ہوا، جیسے اس نے پراسرار شاعر کو چھو لیا ہے۔ رگ و پے میں کئی خوابیدہ تار جھنجھنا اٹھے، بارش جیسے تھم گئی اور آسمان کے بھیگی جھروکوں سے جیسے کئی حسین حوریں یہ انوکھا ناٹک دیکھنے لگیں!

اس کا ایک قدم اٹھتا، تو چکی کے پاٹ ہزار دفعہ اس کے دماغ میں گھوم جاتے اور پھر جب اُس نے سامنے دیوار میں مٹی کا ایک دیا بھی دیکھا جس کی زرد لَو کے اردگرد بیشمار پتنگے گھوم رہے تھے اور جس کی نوک سے دھوئیں کی ایک مبہم سی سیدھی لکیر نکل کر کئی بل کھا جاتی تھی، اُس کی آنکھیں جل اٹھیں اور پلکوں پر اٹکی ہوئی بوندیاں چنگاریاں بن گئیں۔ اور پھر ـــــ!

اور پھر اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ دھرا اور آواز آئی۔

"کون ہے تو؟"

"سیماں" اس نے خوف آلود بھولپن سے کہا۔

"سیماں کون؟" بولنے والا اس طرف گھوم آیا اور سیماں نے دیکھا کہ وہ شاعر تھا، جس نے چراگاہ میں میٹھے میٹھے گیت گا کر فضا میں عطر چھڑک دیا تھا۔ اس کے لمبے بالوں سے پانی کے قطرے اس کے شانوں پر گر رہے تھے۔ اُس کا لباس تر بتر تھا اور اُس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔

"کون سیماں؟" اُس نے پھر پوچھا۔

اور سیماں گھبرا کر بولی "سیماں —— چکی پیسنے والی!"

اور شاعر کے ہونٹوں پر ایک مقدس مسکراہٹ کھیلنے لگی، اس نے کچھ سوچ کر آسمان کی طرف دیکھا اور کھنڈر میں جاتے ہوئے بولا —— "اندر آجا سیماں۔"

"جی بس، میں اب جاتی ہوں۔" سیماں بے بس ہو کر بولی۔

"لیکن یہاں آئی کیسے؟"

"رستہ بھول گئی تھی"

"کہاں جانا تھا تجھے؟"

"جی معلوم نہیں کہاں جانا تھا"

"یعنی تو بے گھر ہے؟"

"جی گھر تو ہے میرا"
"مجھے پہچانتی ہے؟"
"ہاں جی۔ تم شاعر ہو"
"تو نے میرے گیت سنے؟"
"جی سنے"
"اچھے تھے؟"
"جی اچھے تھے"
"پسند آئے؟"
"اچھے جو تھے جی ——— اچھی چیزیں ہی پسند آتی ہیں۔"
"تو نے ——— لیکن تو اندر کیوں نہیں آجاتی۔"
سیماں سمٹی ہوئی اندر چلی آئی اور بے کواڑ کے دروازے پر بیٹھ گئی، شاعر جس کے سر کا سایہ اب سیماں کے چہرے پر پڑ رہا تھا ایک طرف ہو گیا اور سیماں لجا گئی، گالوں پر چمٹے ہوئے بالوں کو الگ کیا، بھیگے ہوئے لباس کو گھما کر سینے پر چیتھڑوں کا ایک انبار سا لگا دیا، اور باہر بجلی چمکی۔ بادل گرجا اور کھنڈر کی بنیادوں میں ڈھول سے۔ بج اٹھے

"سیماں" شاعر بولا۔ "سیماں بی، مجھے یہ تو بتا، کہ تو یہاں آئی کیسے؟"
"سچ سچ کہوں؟" وہ اپنے پاؤں کا انگوٹھا گھورتی ہوئی بولی۔
"ہاں ہاں"

بُرا تو نہیں مانو گے؟"

"نہیں نہیں"

"تمہیں ملنے آئی تھی۔"

"مُجھے؟"

"اُور کسے؟"

"کیوں؟"

"تم نے جی، آج بڑے پیارے گیت سُنائے، تم نے جو دوہے گائے، وہ اب تک میرے دماغ میں گھوم رہے ہیں، تم نے جو بیت الاپے انہیں میں کبھی نہ بھولوں گی، تم بہت بڑے آدمی ہو شاعر — تم بہت اونچے ہو، میں چکی پیسنے والی ہوں، چیتھڑے پہنتی ہوں، میرے گھر کے آنگن میں جو درخت ہے اس کی شاخوں میں پتے ہی نہیں آتے مجھے عرصہ سے جوتا پہننا بھی نصیب نہیں ہوا۔ پر شاعر، تم مجھے اچھے لگے اس لئے تمہیں ملنے چلی آئی، مجھے بس اتنا بتا دو، کہ تم یہ دوہے کیسے کہتے ہو؟"

شاعر جو بے حس و حرکت کھنڈر کے وسط میں کھڑا تھا۔ خاک پر بیٹھ گیا اور بولا "تو نے بہت سی باتیں ایک سانس میں کہہ دیں۔ اور پھر تیرا یہ سوال بڑا عجیب ہے، کہ میں دوہے کیسے کہتا ہوں۔ سُن جب میں دوہے کہنے لگتا ہوں تو میرے دل کی خاموشیوں میں پہلے ایک ساز بجتا ہے بڑا میٹھا اور پیارا ساز۔ ایسے ساز اس دنیا میں نہیں بجا کرتے

میری رگوں میں ساز کے تاروں کی من موہنی جھنجھناہٹیں تیرنے لگتی ہیں میں اس زمین پر سے اوپر اٹھ جاتا ہوں، میں نے کئی بار زمین سے ابھر کر تاروں کو چھو لیا ہے، اور پھر جب میں تاروں کی اجالوں بھری دنیا میں پہنچتا ہوں، تو بیشمار خوبصورت پرچھائیاں میرے ارد گرد آ کر ناچتی ہیں، سُنا؟ دیر تک ناچتی رہتی ہیں، ادھر میرے دل میں ساز کی جھنکار، ادھر پرچھائیوں کا رقص، ادھر ستاروں کی تھرتھراہٹیں، دوہا خود بخود بننے لگتا ہے، اور جب ساز کی آواز بند ہوتی ہے، تو رقص بھی ختم جاتا ہے تارے بھی دھندلا جاتے ہیں، اور میں ایک نیا دوہا الاپنے لگتا ہوں۔"

"پر شاعر" مبہوت سیماں بولی "میں تاروں تک کیسے ابھروں؟

"تو نے کبھی کوشش بھی کی ہے اُبھرنے کی؟"

"جی کی تو ہے، اور ایک گیت بھی شروع کیا ہے۔"

"سُنا تو"

"ختم کر لیا تو سُناؤں گی۔"

"کیسا ہے؟"

"یہ تمہیں معلوم ہو جائے گا لیکن اگر میں تمہیں اس وقت کہوں، کہ کوئی دوہا بناؤ، تو بنا سکو گے؟"

"ہاں"

"لیکن تم کھنڈر کے فرش پر بیٹھے ہو، اور گیت بنانے کے لئے تمہیں تاروں کی طرف جانا پڑتا ہے، اور پھر آج تم ابھر بھی تو نہ سکو گے،

ابر چھا رہا ہے، تاروں کا نشان تک نہیں ملتا۔"

"میں اس وقت تاروں کے اجالے بھرے دیس میں ہوں۔"

"کیسے؟"

"تو نہیں سمجھ سکے گی"

"اچھا تو کوئی دوہا کہو۔"

اور شاعر کی نقرئی آواز نے بارش کی سنسناہٹیں اپنے اندر جذب کر لیں:۔

سبحان اللہ! یہ آنکھیں اس قدر خوبصورت ہیں،
جیسے پو پھٹنے سے قبل آسمان پر تارے!
یا دو سیاہ بھونرے جو باغ میں والہانہ اڑتے پھرتے
ہوں! یا دو لس لس کرتے ہوئے چراغ جو دریا کے
اُس پار ٹمٹما رہے ہوں!
یا میری تقدیر کے دو حرف جو ہر لمحہ اپنی ہار
مان رہے ہوں!

اور جب دوہا ختم ہو چکا تو شاعر سیماں کے قریب ہو کر بولا۔" یہ دوہا میں نے تیری آنکھوں پر کہا ہے۔"

"جی؟" ـــــ اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تیری آنکھیں مجھے اس طوفان زدہ رات میں تاروں کے دیس تک لے گئیں۔"

"جی؟" سیماں باہر جانے لگی۔

شاعر نے اپنی جیب سے ایک سوکھا ہوا زرد پھول نکال کر سونگھا۔

"ارے!" سیماں گھبرا گئی اور کھنڈر سے نکل کر ٹیلے کی طرف بھاگی اور جب پلٹ کر کھنڈر کی طرف دیکھا تو دیا بجھ چکا تھا، بوندیاں تھم چکی تھیں اور پوربی افق پر دو تارے بھی ٹمٹما رہے تھے —— اس نے اپنی آنکھیں ملیں اور تیز تیز قدم اٹھاتی گاؤں میں آگئی، اور جب اپنی کوٹھڑی میں قدم دھرا تو فرش کیچڑ بن چکا تھا، لیکن اس کے دماغ میں الجھے ہوئے مختلف خیالات گھوم رہے تھے میری آنکھیں —— تاروں کا دیس —— سرسوں کا پھول —— رازبھرا شاعر —— اور —— اور —— یہ سب کیا ہے؟ اس کے سامنے دھوئیں کا ایک گول مول سا غبارہ گھومنے لگا، اور جب گھر پہنچی، تو اس نے نانا نانا نن نن نانا کی دھن پر ایک اور بند کہا:۔

تو تاروں میں بسنے والا، عرش پہ رہنے والا
میرے سر پہ پھٹا پرانا میلا سا دوشالا
سورج کے پاؤں دھرنا،
بانکے،
مجھ سے بیت نہ کرنا!

شاعر نے اس کے بعد چراگاہ میں بیشمار لوگوں کے درمیان لاتعداد گیت گائے اور سیماں لڑکیوں میں چھپ چھپ کر انھیں سنتی

رہی، اور جب گھر آئی، تو آئینے کے ایک میلے سے ٹکڑے میں اپنا عکس دیکھتی رہی اور اسے یقین ہو جاتا کہ شاعر نے سب گیت اسی کے متعلق لکھے ہیں، اُس کی آنکھیں بالکل روشن ستاروں کی طرح ہیں، اُس کے بال بالکل گھٹاؤں ایسے ہیں۔ اس کے ہونٹ بالکل نو دمیدہ پنکھڑیاں ہیں، اس کی چال میں مستی اور آواز میں ترنم ہے، اور شاعر ہر گیت ہر دوہے میں یہی باتیں دہراتا ہے "اچھا شاعر — پیارا موسیقار!

لیکن وہ اس کھنڈر کی طرف پھر کبھی نہ گئی، کیونکہ اسے خوف تھا، کہ شاعر اس کے بالوں کی تعریف میں کوئی دوہا کہہ دیگا اور وہ شرما جائیگی اور پھر یہ شرم ایک دوشیزہ کے لئے کتنا بڑا عذاب ہے — یہ دوشیزائیں ہی جانیں!

اُس کے سینہ میں محبوب امنگوں کا ایک طوفان بپا تھا، کہاں چاند کہاں خاک کا حقیر ذرہ، بڑی انوکھی بات ہے۔ لیکن سیماں کو یقین تھا کہ شاعر اسے بھولے گا نہیں، وہ اس کے پاس آئے گا! اور پھر ہمیشہ کیلئے اس کے ہاں رہے گا، وہ دونوں رات کی خاموشیوں میں سنسان ٹیلوں سے ورے کھنڈروں میں چھپ کر ستاروں کے اجالوں بھرے دیس میں اڑ جائیں گے، گیت بنائیں گے، دوہے گائیں گے، نہ یہ چکی کی منحوس کھسر پھسر ہوگی، نہ یہ ڈراؤنا درخت نہ یہ کمبخت ٹڈا — اور اگر یہ بات نہیں، تو شاعر نے سرسوں کا پھول اپنی جیب میں کیوں محفوظ رکھا، سیماں کی آنکھوں پر اس نے دوہا کیوں بنایا! وہ سب باتیں سوچتی

اور اس حد تک سوچتی، کہ اکثر شاعر کا خیالی پیکر اس کے قریب آکر گنگناتا۔

سبحان اللہ۔ یہ آنکھیں اس قدر خوبصورت ہیں جیسے ........

اُس نے ان دنوں میں گیت ختم کرنے کی کوشش کی اور ایک بند بھی بنا لیا۔

ساون رُت ہے تیری سہیلی دھوپ میری ہمجولی
ساون کی اندھیاری رُت میں دھوپ کا اللہ بیلی
مجھ پر دوش نہ دھرنا
بانکے
مجھ سے پیت نہ کرنا

لیکن اس نے محسوس کیا کہ گیت ہنوز ادھورا ہے، اور پھر ایک صبح کو جب وہ اٹھی تو یہ ارادہ کر کے کہ آج رات وہ پھر کھنڈر کا چکر لگائے گی۔ دیکھئے تو سہی، کہ اس کے خوابوں کا راجہ کس رنگ میں ہے، اس نے لاکھ سر پٹخا کہ گیت مکمل کر لے تاکہ رات کو شاعر کے سامنے پیش کر سکے۔ لیکن ناکام رہی اور شام کو جب وہ ایک گھر میں چکی پیس رہی تھی تو اسے یہ خیال آیا کہ شاید یہ گیت شاعر ہی مکمل کر دے، وہ یہ خیال آتے ہی اچھل پڑی اور زیر لب گیت گنگنانا چاہتی تھی کہ گاؤں کی ایک بوڑھی کھوسٹ بھٹیارن لاٹھی ٹیکتی آئی اور اس کے کانوں کے قریب اپنے ٹھنڈے مرجھائے ہوئے ہونٹ لا کر بولی "سیماں بیٹی!"

سیماں نے چونک کر چکی روک لی۔ "کہو خالہ۔"

"چکی گھمائے جاؤ، سیماں بیٹی" بوڑھی ادھر ادھر دیکھ کر بولی "بڑے راز کی بات ہے۔"

چکی کی گھمر گھمر میں سیماں نے پوچھا "لو اب کہو۔"

"وہ جو شاعر آیا تھا نا ہمارے گاؤں میں۔ وہ آج چلا گیا ہے۔"

"چلا گیا!" سیماں نے چکی روک لی۔

چکی گھمائے جاؤ بیٹا —— وہ چلا گیا ہے، وہ کھنڈر میں تمہارا منتظر رہا، مگر شاید تمہاری ہمت نہ پڑی، تم نہ جا سکیں، آج اس نے مجھے بلا کر دس روپیہ کا یہ نوٹ دیا، اور کہا کہ یہ سیماں کو دیدینا اور کہنا کہ وہ یہاں سے لاری پر سوار ہو کر خوشاب پہنچے اور وہاں سے گاڑی پر سوار ہو کر لاہور آجائے اگر تم کل صبح یہاں سے روانہ ہو جاؤ، تو وہ پرسوں صبح تمہیں لاہور اسٹیشن پر ملے گا، وہ کہتا تھا کہ تم اس کی گیتوں کی ملکہ ہو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا تھا، کہ دیر نہ کرنا —— اور پھر یہ پھول بھی دیا تھا اس نے نشانی کے طور پر۔"

سیماں نے جھپٹ کر بڑھیا سے پھول چھین کر مسل ڈالا۔ دس روپوں کا نوٹ اس کی مردہ مٹھی میں گھسیڑ کر بولی۔ "تو اب جا خالہ بی۔ ورنہ چکی کے پاٹ سے سر پھوڑ دوں گی تیرا —— کاٹ کھاؤں گی تجھے!

بڑھیا لاٹھی ٹیکتی چلی گئی، اور سیماں نے اس زور سے چکی گھمائی کہ آٹا آندھی کی طرح اٹھ کر سارے کمرے میں پھیل گیا۔ ایک بار ہتھی اکھڑ گئی سیماں پیچھے گر گئی چکی کا پاٹ کھسک کر آٹے میں دھنس گیا

اور سارے گھر والے اکٹھے ہو کر اس پر برس پڑے!

اور پھر اُس رات جب وہ کھنڈر کے قریب پہنچی، تو گیت مکمل کر لیا اور ٹیلے پر بیٹھ کر آخری بند گنگناتی رہی:۔

میری نیا طوفانوں میں پھنس کر غوطے کھائے
تو ساحل پر بیٹھا مجھ کو اپنے پاس بلائے
مشکل پار اترنا
بانکے
مجھ سے پیت نہ کرنا

لیکن اُس نے محسوس کیا کہ گیت ابھی ادھورا ہے، کیونکہ شاعر جا چکا تھا اور اندھیرے کھنڈر پر ایک اُلّو بیٹھا ہولناک دوہے الاپ رہا تھا!

# بوڑے کی باچھیں

اجی شالامار کون جائے! مجھے تو وہ بوسیدہ فصیل اور وہ خاموش فوّارے اور وہ کالے کالے تنوں والے دیو قامت درخت اور وہ حیران و ویران بارہ دریاں دیکھ کر مغلوں کا زمانہ یاد آجاتا ہے، جب ہندوستان کا دل ایک خاص تال پر دھڑکتا تھا۔ میں وہاں جانے سے یہی بہتر سمجھتا ہوں، کہ اسی اندھیرے کمرے میں پڑا اونگھتا رہوں مجھے ان لوگوں پر ہنسی آتی ہے، جو شام کو ٹولیاں بنائے شالامار کا رُخ کرتے ہیں، اور رات کے اندھیرے میں واپس آتے ہیں، تھکے ماندے قہقہوں کے ذخیرے ختم کیئے! آنے والے دن کو کابوس کی طرح سینے پر سوار کیئے! بٹوے کو خالی دیکھ کر آئسکریم سے ٹھٹھری ہوئی زبان اور تالو میں تپش سی محسوس کرتے ہوئے! ۔۔۔ ہندو کہتا ہے "سب ہندوؤں کا مال تھا، جس سے یہ فضول عمارتیں کھڑی کی گئیں" مسلمان کہتا ہے "سب ہندوؤں کی کارستانی ہے۔ ورنہ ہندوستان کا دل اسی تال پر دھڑکتا رہتا" سکھ کہتا ہے "کہاں رنجیت سنگھ کی سمادھ کی نزاکت اور کہاں جہانگیر کے مقبرے کا بھدّا پھیلاؤ!" ۔۔۔ گلے شکوے ۔۔۔

گالی گلوج —— صبح کو شکن آلود بستروں سے اٹھتے ہیں تو کھوئے کھوئے اور کملائے کملائے! بیویوں سے جھڑپ کہ چائے میں شکر کیوں زیادہ ڈال دی گئی، بچوں کے گالوں پر طمانچے کہ انھوں نے کوٹ کی آستین سے ناک کیوں صاف کی، نوکروں کو گھرکیاں، کہ وہ پیرٹ پالش کی جگہ کو برا پالش کیوں لے آئے! —— بھئی دراصل میں اسی وجہ سے شالامار نہیں جانا چاہتا۔"

کوئی اور وجہ؟ بچوں کی سی ہٹ ہے تمہاری، اور کیا وجہ ہوسکتی ہے! لیکن دوست —— اگر میں تمہیں ایک اور وجہ بھی بتا دوں تو مجھے پاگل تو نہیں کہو گے؟ کئی بار مجھے شالامار جانے کا اتفاق ہوا ہے، اور اب میں جی ہی جی میں پچھتاتا ہوں، کہ زندگی کے وہ قیمتی لمحے میں نے کیوں ضائع کئے! دراصل جوانی کے زمانے کا ہر واقعہ ایک مستقل پشیمانی سے کسی طرح کم نہیں!

ایک دعوت میں ہم دونوں کا تعارف کرایا گیا۔ میرا اور زہرہ کا اس روز اس نے سبز ساڑی پہن رکھی تھی۔ جس کے حاشیہ پر نقرئی تار ٹکے ہوئے تھے۔ اور چونکہ وہ برقی پنکھے کے عین نیچے بیٹھی تھی، اسلئے ساڑھی کا پیہم تھرتھراتا ہوا پلّو اس کے کاندھے پر سے ڈھلک ڈھلک جاتا تھا۔ دو چار بار میری انگلیاں اس ملائم کپڑے سے مس ہوئیں اور اس کی ٹھنڈک میرے خون کو منجمد کرتی۔ میرے پاؤں کے تلووں میں چٹکیاں سی لینے لگی۔ میں اس کے ساتھ ہی تو بیٹھا تھا، او ایک بار

اس کا پلّو جو تھرتھرایا، تو میرے سر پر پھیل گیا۔ اور میرے ہاتھوں میں کانٹا اور چھری کانپتے رہ گئے! سب لوگ ہنسنے لگے۔ میں نے خنک ملائم ریشم کے نیچے سے سر نکالتے ہوئے کہا قہقہے نہ لگائیے، میں ان کی پناہ میں ہوں! —— گلابیاں دوڑ گئیں زہرہ کے ہلکے گلابی گالوں پر، پلّو کو کاندھے پر جما کر بولی "شکریہ" اور پھر یونہیں میرا خیال اس کے ہونٹوں کی طرف منعطف ہو گیا —— ارے! اتنے باریک ایسے گلابی ہونٹ! ان میں کتنا رنگ اور کتنا رس ہے، اور ان کے گوشے کتنے گہرے اور نفاست سے ترشے ہوئے ہیں! اور ان گوشوں کی تکونی گہرائیوں کی مبہم لرزشیں جنھیں صرف میں ہی دیکھ سکتا ہوں۔ اپنے اندر کتنے ہلکے پھلکے جذبات کو چھپائے ہوئے ہیں! —— اور میری نظریں آوارہ ہو گئیں —— اور کنپٹیوں پر باریک بالوں کے تار —— ٹھوڑی کی صاف گولائی۔ گردن کے سیدھے خطوط اور سنبر ریشم سے جھلکتی ہوئی مخروطی باہیں —— اور پھر میری نظریں بھٹک گئیں اور جونہی ایک بار زہرہ کی نظروں سے اُن کی مٹھ بھیڑ ہوئی، تو مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے اچانک میز کو کسی نے الٹ پلٹ دیا ہے اور ہر طرف ٹوٹی ہوئی پلیٹوں سے ٹکڑے ٹنٹنا کر بکھر گئے ہیں!

میں دراصل بچپن ہی سے کھیلوں کا بہت شوقین ہوں پر دیسی اور بدیسی کھیل کھیلا ہوں۔ اور گو ہر کھیل میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا لیکن کھیل کھیلنے میں جو لذّت ہے، اس سے اچھّی طرح

لطف اندوز ہو چکا ہوں۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد جب مجھے اور کوئی کھیل نہ ملا تو میں ادھر متوجہ ہوا ـــــ کھلونے ہی تو ہیں یہ لڑکیاں ـــــ یہ شوخ و شنگ پریاں جن کی بھری بھری گوری کہنیوں کے پپلاتے ہوئے گڑھے اور ہلکے گلابی رخساروں میں قمقموں کے عکس انھیں جاپانی گڑیوں کی شکل دیدیتے ہیں، جی ہاں ـــــ جاپانی گڑیاں ـــــ اٹھا کر سر پر بٹھا لو یا فرش پر پٹخ کر لتاڑ دو ـــــ اور پھر کھیل میں کیا کچھ روا نہیں ہوتا!

اور اس روز اس پیشہ ور کھلاڑی کو یہ نیا کھیل کھیلنے کی سوجھی!

لیکن یہ کھیل کمبخت بہت طول پکڑ گیا لے جانے بوجھے بس آنکھیں کھلیں، تو مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے میں کوئی کھلنڈرا لڑکا ہوں اور کنکروں سے کھیلتا کُلیلیں بھرتا ایک ایسی بلندی پر پہنچ گیا ہوں، جہاں سے نیچے جھانکنے میں بھی جان کا خطرہ ہے!

یہی تمہارا شالامار ہمارے ان کھیلوں کا میدان تھا ـــــ تحصیلداری میں نام گیا ہوا تھا، سفارشیں کرائی تھیں، لیکن اس کھیل نے آنکھوں پر کچھ ایسی پٹی باندھی کہ مستقبل کے متعلق سوچنا بھی گناہ ہو گیا گھر سے خط پر خط آنے لگے کہ تم کہاں ہو اور کیا کر رہے ہو! کون لکھتا کہ شالامار میں بیٹھا ہوں اور دل کی دھڑکنیں گن رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ یہ لب، جن کے تکونی گوشوں کی لرزشیں مجھے شالامار کی ہر روش پر بکھری ہوئی نظر آ رہی ہیں، کب آگے لپکیں گے، اور میرے لبوں میں

بجلیاں حلول کر جائیں گی! بھائی بند مجھے سمجھانے بجھانے لاہور آنکلے "ابے کچھ کرنا ہے تو کر، ورنہ سر پٹختا پھرے گا اس شہر کی دیواروں سے خودکشی کی نوبت آجائے گی۔ تو کیا کرتا رہتا ہے دن بھر؟" —— انھیں کون بتاتا کہ میں دن بھر اُس برقی پنکھے کو دعائیں دیتا رہا ہوں جس نے زہرہ کی سبز ساڑی کا پلّو پھڑپھڑایا اور میری سوئی ہوئی زندگی کو جھنجھوڑ ڈالا۔

اِنھیں دنوں ایک بار پڑوس کی ایک لڑکی نے کھڑکی سے مجھے جھانکا آپ ہی آپ میرا ہاتھ کوٹ کی جیب میں گھس گیا میں نے سگریٹ کیس نکال کر سگریٹ سلگایا۔ اور دھوئیں کے مرغولے اڑاتے ہوئے میں نے دیا سلائی کو چٹکی پر چڑھا کر کچھ اس انداز سے لڑکی کی طرف پھینکا جیسے کہہ رہا ہوں "اری پگلی تو کیا یہ سمجھے بیٹھی ہے کہ میں جو ہر وقت محبت کے گیت گایا کرتا ہوں، یہ صرف تیرے حسن کا اثر ہے نادان، تجھے غلط فہمی ہوئی ہے، کیا تو زہرہ کو نہیں جانتی؟ وہ تیری ایسی کئی چھوکریوں کو پاؤں کی گرد جھاڑنے پر مامور کر سکتی ہے، اور میں اسی زہرہ سے رات دن کھیلا کرتا ہوں۔ پرے ہٹ میری سامنے سے ورنہ تھوک دوں گا تیرے منہ پر!" —— وہ شاید سگریٹ کے دھوئیں اور اڑتی ہوئی دیا سلائی کی باتیں سمجھ گئی۔ کھٹ اک سے کھڑکی بند کر دی اور میں بہت دیر تک جی ہی جی میں ہنستا رہا کہ کسی کی تمناؤں سے کھیلنے میں کتنا مزا ہے!

گرمیوں کے دن تھے، میں اور زہرہ شالامار میں ایک آم کے درخت تلے بیٹھے تھے، کہ اچانک ایک ننھی سی رنگ برنگی چڑیا اڑتی ہوئی آئی، اور ہمارے ارد گرد دُم نچانے اور پھُدکنے لگی، ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ چڑیا کے آتے ہی ہم آنکھیں جھپکانے لگے اور آخر زہرہ بولی "بڑی خوبصورت چڑیا ہے!"

"ہاں بہت پیاری اور معصوم" میں نے کہا "اور اس کے پروں کے رنگ کیسے ملے جُلے ہیں کہ سُورج کی ایک کرن سے ان پر قوسِ قزح تن جاتی ہے —— یہ چڑیاں تو عام ہیں، یہاں شالامار میں۔"

"اچھا؟" وہ بولی "مجھے تو کبھی اتفاق نہیں ہوا انھیں دیکھنے کا، چڑیماروں کی زد میں آجاتی ہیں یہ؟" اور میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "چڑیماروں کی زد سے شاہین نہ بچ سکے، یہ بیچاری تو تِل بھر کی جان ہے، پھونک مارو تو قلابازیاں کھاتی سامنے تالاب میں جاگرے —— تم دلی کبھی نہیں گئیں؟"

"دلی؟" وہ تعجب سے بولی "میں دلی کبھی نہیں گئی۔ مگر اس سوال کا مطلب؟"

"میرا مطلب یہ ہے۔" میں نے کہا کہ "دلی میں شاہی مسجد کی سیڑھیوں پر اور چاندنی چوک کی پٹڑیوں پر کئی چڑیمار ان چڑیوں کو خوبصورت پنجروں میں بند کئے ٹہلتے نظر آتے ہیں۔ نیلی، پیلی، اودی، گلابی کاسنی اور سُنہری رنگ کی چڑیاں اتنی خوبصورت اور اتنی بیشمار جیسے ربڑ کے جاپانی کھلونے!"

"لگتی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں"۔ میرے لبوں پر ایک بزرگانہ مسکراہٹ نمودار ہو گئی مرد جب عورت سے کسی ایسی چیز کے متعلق باتیں کرتا ہے جو عورت نے نہیں دیکھی، تو اس پر ایک نوع کا غرور سا طاری ہو جاتا ہے۔ میں کچھ بھول سا گیا۔ "ہاں ہاں بیچنے کیلئے ہی وہ پنجروں میں بند کی جاتی ہیں، ورنہ چڑیمار ایسے خوش مذاق کہاں کہ صرف اُن کے حُسن سے متاثر ہو کر انھیں دن بھر ہاتھوں میں لٹکائے پھریں!"

زہرہ کھسک کر میرے بہت قریب آگئی اور میرے شانے پر اپنا سر ٹیکتے ہوئے بولی "تو پھر مجھے دلی لے چلو نا، وہاں دو چار دن سیر بھی کریں گے اور چڑیاں بھی خریدیں گے میں انھیں اپنے مکان کے برآمدے میں لٹکائے رکھوں گی۔ تم چلے جاتے ہو، تو میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگتی ہوں، ان چڑیوں سے من پرچاتی رہوں گی لے چلو نا؟ — لے جاؤ گے نا؟ — بولو نا!"

میں بولتا خاک! — میرے جی میں آئی سامنے پھدکتی ہوئی چڑیا پر جھپٹ کر اسے مٹھی میں دبالوں اور چرمر کردوں، اور پھر زہرہ کو کشمیری بازار میں کسی پُرانے کتب فروش کے پاس لے جاؤں اور اسے جادو کی کتاب میں یہ پڑھواؤں کہ ایسی چڑیاں گھر میں رکھی جائیں تو عزیزوں اور دوستوں سے جدائی ہو جاتی ہے، ان رنگ برنگی پروں کے نیچے خُدا کی لعنت چھپی ہوئی ہے، مجھے کسی ایسی کتاب کا نام تو معلوم

نہیں تھا، لیکن مجھے یقین تھا، کہ اس قسم کی کتاب ہوگی ضرور، کیونکہ ہمارے پرانے لکھنے والوں کے یہی تو چند موضوع تھے! ــــــ تم کھو گئے میں نے ایسا کیوں سوچا، تو حضرت، بات دراصل یہ ہے کہ ان دنوں میرا بٹوہ خالی ہو چکا تھا!

ابتدائی کھیلوں میں میرا بٹوہ محفوظ رہا۔ لیکن میں اتنا جانتا تھا، کہ محبت کی بازی میں طرفین میں سے کسی ایک کے بٹوے کو مجبوراً اپنا سب کچھ اُگل دینا پڑتا ہے، زہرہ کی محبت میں یہ قرعہ میرے بٹوے کے نام پڑا۔ لاہور میں بڑے بڑے آدمیوں سے ملنے، ٹھاٹھ سے رہنے اور دیگر متفرق اخراجات کے لئے جو رقم میں اپنے والدین سے لایا تھا، وہ بہت سی ساڑھیوں، کلائی کی ننھی منی طلائی گھڑیوں اور غازے مسی کے بے شمار مرمریں ڈبوں پر خرچ ہو چکی تھی۔ گو میں آج تک اس بات کا قائل ہوں کہ انسان محبت اور دوستی میں اپنے بٹوے کو حتی الوسع اپنے دوستوں کی ضرورتوں کی دستبرد سے محفوظ رکھے ورنہ کچھ دیر بعد اس کا پچھتاوا بے سود ہوگا۔ ادھر اس کا بٹوا باچھیں کھول کر اپنی بے بسی کا اظہار کرے گا، اُدھر اس کے دوستوں کے ماتھوں پر چتونوں کے جال بچھ جائیں گے۔ لیکن بے جانے بوجھے دور اندیشی کو محبت کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا کر میں اپنے کوٹ کی اندرونی دائیں جیب کو زہرہ کی التجاؤں کی زد سے نہ بچا سکا۔ ادھر وہ تکونی گوشوں والے گلابی لب ملے۔ ادھر جھپاک سے چرمی بٹوا

چر چر بولتا کھلا۔ اور میز پر بہت سے نیلے نوٹ برقی پنکھے کی لہروں میں پھڑپھڑانے لگے! بے بس تھا میں! دراصل میں نے اس سے قبل اتنے ملائم بال۔ ایسے خوبصورت گال، اس قسم کے کپکپاتے ہوئے ہونٹ اس درجہ متناسب اعضا اور اس قدر گول پنڈلیاں یوں آنکھ بھر کر نہیں دیکھی تھیں ——— اور جب ان کھلونوں سے کھیلنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہ تھی، اور میں یہ بھی محسوس کرتا تھا، کہ ان کے بغیر نہ ٹٹوے کے بھولے رہنے میں لذت، نہ اپنے وطن واپس چلے جانے میں ——— اس لئے میں نے ان خیالات سے جو میرے دل میں اول اول گڑی ہوئی سوئیوں کی طرح کھٹکتے تھے۔ آنکھیں بند کر لیں اور اب جب کہ بدقسمتی سے زہرا نے وہ خوبصورت چڑیا بھی دیکھ لی تھی اور دہلی جانے کے لئے اس نے میرے بدبخت شانے سے اپنے گلابی گال بھی ٹکا دیئے تھے، تو میں پریشان سا ہو گیا! گھبرا کر بولا "لیکن اگر یہیں نیلے گنبد کے آس پاس ہی تمہیں ان چڑیوں کا ایک غول خرید دوں!—— پھر؟

آنکھیں جھپکانے لگی اور پھر میرے شانے سے اپنا سر ہٹا کر بولی۔ "لیکن دہلی کیوں نہ چلیں؟"

"وہاں کیا رکھا ہے؟" میں کھسیانا ہو کر نہایت مکروہ ہنسی ہنسا۔

"یہی لال قلعہ، شاہی مسجد، ہمایوں کا مقبرہ اور کناٹ سرکس۔ دو چار عمارتیں، دو چار آڑی سیدھی سڑکیں۔ پست قد تیلے باشندے، جن کے چست پاجامے اور ململ کی ٹوپیاں دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے فینسی ڈریس شو ہو رہا ہے۔

اور چونکہ وہ انبالے کی رہنے والی تھی اس لئے دہلی والوں کی وکالت کرتے ہوئے بولی! اور یہاں ـــــ یہاں سات سات گز کی شلواریں جیسے مصری رقاصاؤں کے گھگرے! ہاتھ ہاتھ بھر لمبے جوتے۔ چوڑے سینوں اور لمبی لمبی ٹانگوں والے دیو ـــــ اور ان سب کے سر پر دس دس سیر کا پگڑ! یہی تو وجہ ہے کہ پنجابی بدحواس ہوتے ہیں!"

میں نے سوچا اگر یونہی باتوں باتوں میں یہ چڑیاں میری زہرہ کے دماغ سے اڑ جائیں تو لطف آ جائے! میں اس کے بعد کہیں سے کچھ مانگ تانگ لوں گا۔ مگر زہرہ آج صبح ہی دہلی جانے کے لئے تیار ہو بیٹھی تو میں کہاں سر پھوڑتا پھرونگا اور اس کے کھلنڈرے دل پر کیا گزر جائیگی!

لیکن جونہی میں نے دہلی والوں کے زرد دانتوں اور بچے کھچے مسوڑوں کے متعلق کچھ کہنا چاہا، وہ میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں دباتے ہوئے بولی۔ "چلو گے نا دلّی؟"

اور میں گھبرا کر بولا۔ "لیکن اگر یہیں نیلے گنبد سے تمہیں چڑیاں مل جائیں، تو کیا فائدہ دلّی چکر لگانے کا! ـــــ لاہور لاہور ہے اور اور دلّی دلّی!"

"کیا مطلب؟" اس نے بھویں چڑھا کر پوچھا۔

"یہ ایک محاورہ ہے!" میں نے بدحواس ہو کر کہا۔ اور جب میں نے سامنے دیکھا، تو چڑیا کمبخت اسی طرح گھاس پر پھدکتی پھر رہی تھی۔

چڑیاں تو نیلے گنبد سے لا دی گئیں مگر زہرہ کے دونوں ابروؤں کے

درمیان اس دن سے ایک لکیر سی پیدا ہو گئی۔ جیسے کہہ رہی ہے "میں سب کچھ سمجھ چکی ہوں صاحب!"

اور میں اپنے دھڑکتے دل کو سمجھاتا "ارے کمبخت ابروؤں کے درمیان یہ ذرا سی لکیر تو حسن کا ایک محبوب انداز ہے۔ سچی محبت میں روپے پیسے کا کیا دخل! یہ دل کی باتیں ہیں، اور دل سونے چاندی کا نہیں آنسوؤں اور مسکراہٹوں کا غلام ہے!

لیکن دوسرے ہی دن بدقسمتی سے جوش کی ایک نظم میں ہم نے صبح بنارس کا ذکر پڑھا!

"بنارس کی صبح!" اس نے پوچھا "کیا بنارس کی صبحیں ایسی دلکشا ہوتی ہیں۔ کہ جوش ایسا شاعر اپنی نظموں میں انھیں زندۂ جاوید کہہ رہا ہے!"——

اور میں اس پرانی کمزوری کی زد میں آگیا، عورت کو کسی راز سے آگاہ کرتے ہوئے مجھ میں بے محل سا غرور بھر جاتا ہے، پھول سا گیا میں! بولا "اری، اودھ کی شام اور بنارس کی صبح کے تو سب اردو شاعروں نے گیت گائے ہیں"—— اور پھر میں صبح کے متعلق جتنی شاعری کر سکتا تھا کرتا رہا!—— اور آخر وہ میرے شانے سے اپنے نرم گال ٹکاتے ہوئے بولی۔ "مجھے بھی بنارس کی دس پندرہ صبحیں دکھا لاؤ نا!"

اور میں نے دیکھا کہ سامنے فضا میں بنارس کے مندروں کے اونچے اونچے کلس اندھیرے میں ڈوبتے ڈوبتے ناپید ہو گئے ہیں،

میں آج رات سینما دیکھنے کا خرچ اپنے ایک دوست سے مانگ لایا تھا، بنارس جانے کے لئے تو بہت سی رقم درکار تھی! اور پھر بنارس کی ایک نہیں اکٹھی دس پندرہ صبحیں دیکھنا تھیں! ــــ میں نے کہا لیکن زہرہ لاہور کی صبح کا مقابلہ تو کشمیر اور سوئٹزرلینڈ کی صبحیں بھی نہیں کر سکتیں!"

مگر وہ تو اچانک تن گئی، یوں بولی جیسے اپنے کسی کمسن ملازم کو ڈیٹ رہی ہے، "تم مجھ سے محبت کرتے ہو، یا کھیلتے ہو. اس روز تم نیلے گنبد سے چند چیختی ہوئی چڑیاں اٹھالائے، کسی کی دم نہیں، تو کسی کا سر گنجا ہے، کوئی پنجرے کے ایک کونے میں پڑی دم توڑ رہی ہے، اور کوئی اپنی بہن سے لڑ رہی ہے! ــــ تم پہلے دہلی جانے سے کترا گئے! اب بنارس کا نام سن کر تمہارا چہرہ فق ہو رہا ہے! میں اس منحوس شالامار کی کائی دیواروں کے اندر محبوس نہیں رہ سکتی. مجھے چاہتے ہو تو بنارس لے چلو، ورنہ (اور یہاں اس کی آواز بھرا گئی) ورنہ راوی میں جا کر ڈوب آؤ، کہ تمہارا بٹوہ بھی محفوظ رہے، اور ایک بلا سے بھی تمہیں نجات مل جائے! ــــ یہ بھی کوئی زندگی ہے! شالامار سے مکلوڈ روڈ اور مکلوڈ روڈ سے شالامار، وہی لمبی سلیٹی سڑک، وہی لال لال روشیں، وہی بوڑھے کھوسٹ درخت ــــ کیا صلاح ہے تمہاری!"

"میں کل شام کے پانچ بجے یہیں شالامار میں تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گا." میں نے آہستہ سے کہا اور پریشانی میں کوٹ کے

کالر میں الجھا ہوا گلاب کا پھول مسل ڈالا!

"بہت اچھا" وہ طنزاً بولی، مجھے شانے پکڑ کر اٹھایا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک بار پھر کہا۔ "بہوووووت اچھا!"

میں گھبرایا ہوا سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ انکواری آفس سے بنارس تک سکنڈ اور انٹر کلاس کا کرایہ پوچھا۔ کاش بنارس یہیں امرتسر کے آس پاس ہوتا۔ میرا دل پکارا۔ اور جیب میں لے کرایہ سنا تو بدحواس سا ہو گیا، جیسے انجن چل رہے ہیں دماغ میں اصاف فرش پر پھسلتے پھسلتے بچا۔ بھاگا ایک دوست کے ہاں گیا، پھر دوسرے کے ہاں، پھر تیسرے کے ہاں، اور تھک ہار کر دہلی دروازے کے باہر گھاس کے ایک گیلے قطعے پر دھم سے گر پڑا۔ سوچتے سوچتے دماغ بھنایا تو غالب کی ایک غزل گنگنانے لگا۔ ع

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا

گنگنا رہا تھا کہ سامنے پولیس کی ایک چوکی سے سپاہی اٹھ کر آیا۔ "ابے تان سین کے بچے، تجھے یہ نہیں معلوم، کہ یہ چوکی ہے، اور یہاں پولیس کے سپاہی دن بھر کی تھکن سے چور سو رہے ہیں، اٹھ یہاں سے ورنہ؟......!

اور جب میں اٹھا، تو اس نے مدھم چاندنی میں میرا سوٹ دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ "ارے بابو صاحب شاید آپ کو نوکری نہیں ملتی!"

اور پھر سرکنڈے کی چوکی کی طرف جاتے ہوئے کہنے لگا "ہر رات کتنے

بابو یہاں آکر یہی گانا گاتے ہیں! اخیں! اخیں! اخیں! اخیں!"
اور میں آہستہ آہستہ زیر لب بولا "سنتری جی، تجھے کیا معلوم کہ مجھے نوکری سے زیادہ بنارس کے کرایہ کی ضرورت ہے ——— بنارس کی پندرہ صبحیں دیکھنے کے لئے!" ——— میں بوقلموں چڑیا اور جوش کی نظم کا مارا ہوا ہوں، تو کیا جانے ——— اسے دن بھر بھدّے بوٹوں پر کالی پالش تھوپنے والے اور راتوں کی بھیانک خاموشیوں پر پہرہ دینے والے، تو کیا جانے!"

میرے دماغ میں بچپنا عود کر آیا، مجھ سے کچھ ایسی حرکات سرزد ہونے لگیں جو خود میری نظر میں مضحکہ انگیز تھیں۔ دن بھر میں حیران اور سراسیمہ شہر میں گھومتا رہا، سوچتا رہا کہ زہرہ کے سامنے کن الفاظ میں اپنی بے لبسی کا اظہار کروں گا اپنے کمرے میں آئینہ سامنے رکھ کر کئی بار اپنے چہرہ پر شدت کی بے دست و پائی طاری کرتے ہوئے اور آنکھوں میں آنسو لاکر بولا "زہرہ پیاری مجبوریاں بھی ہوتی ہیں ——— اگر خدا بندوں کو سارے اختیارات دیدے، تو پل بھر میں ساری دنیا ملحد ہو جائے، روشنی کے ساتھ سایہ بھی ضرور ہوتا ہی دراصل بہت دنوں سے میرا بٹوا ——— بات تکمیل کو نہیں پہنچی تھی، کہ قلب پر ایک دھچکا سا لگا۔ چہرے کا رنگ فق کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اور نئے سرے سے آنسوؤں کی دھار بہا کر کہنے لگا "تمہیں مجھ سے محبت ہے نا! پھر یہ بنارس کی صبح اور دہلی کی چڑیوں کے مخمصے کیسے!

تم اگر میرے پاس ہو، تو ہر صبح صبح بنارس ہے اور ہر چڑیا دہلی کے چمڑی ماروں والی ——— "تم ہو تو میرے پاس سب کچھ ہے۔ اور اسی طرح میں ہوں، تو تمہارے پاس سب کچھ ہے، پھر یہ روٹھنا کیسا یہ چتون کیسی ——— ارے من جاؤ نا!"

خیالات کی اسی کشمکش میں شام کے پانچ بج گئے، میں ایک کمرہ اڈے سے ایک یکہ لے کر شالامار کی طرف جھپٹا، چھ بجے میں شالامار کے صدر دروازے کے قریب پہنچا۔ جی میں آئی، دن بھر کی سوچی ہوئی التجاؤں کو زہرہ کے قدموں میں نچھاور کر کے اسے سینما لیجاؤں اس طرح شاید اس کی خفگی کم ہو جائے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا میری پاس اتنی رقم بھی ہے یا نہیں۔ میں نے بٹوا نکالا۔ شالامار کی ہوا کھاتے ہی اس نے اپنی لمبی لمبی باچھیں کھول دیں ——— اچانک میرے ہاتھ سے ایک ملائم اور خنک کپڑا مس ہوا۔ میں نے نظریں اٹھائیں تو زہرہ نقرئی تاروں والی سبز ساڑھی پہنے ایک نوجوان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک ننھی سی موٹر کی طرف ٹھمکتی جا رہی تھی!

"زہرہ۔ زہرہ" میں پکارا۔ اور اس کے پیچھے بھاگا۔

وہ موٹر کے پائدان پر ایک پاؤں رکھ کر مجھے گھورنے لگی ابرو کے درمیان پتلی سی لکیر اب زیادہ گہرائی اختیار کر گئی، طنزاً مسکرا کر بولی ——— "ہیلو!

میں نے پوچھا۔ "کدھر جا رہی ہو؟"

موٹر کے اندر نوجوان کے زانو کا سہارا لے کر بیٹھتے ہوئے اُس نے کہا "بنارس!" پھر چلتی ہوئی موٹر سے دو انگلیاں نکال کر ہلاتی ہوئی بولی۔ "بائی۔بائی!" —— اور وہ اور نوجوان زور زور سے قہقہے لگاتے سامنے سلیٹی سڑک پر مارتے ہوئے نکل گئے" بہت دیر تک اُن کے قہقہے میرے کانوں میں گونجتے رہے اور جب میں نے اپنے بٹوے کی طرف دیکھا، تو وہ جیسے باچھیں پھیلائے میری حالت پر ہنس رہا تھا! میں نے جھلا کر اُسے زمین پر پٹخ دیا۔ اور مغلپورہ میں انجنوں کے شیڈ کی طرف بھاگ گیا، جہاں آہنی پہیوں کی گڑگڑاہٹوں نے میرے تپتے ہوئے دماغ کو سکون بخشا!

میں اب شالامار نہیں جاؤں گا، پرانی عمارت ہے، بیکاروں کی سیرگاہ ہے، اور پھر —— دوست میں ڈرتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ مجھے کسی جھاڑی کے پیچھے وہ بٹوا نظر آ گیا —— اور پھر اُس بٹوے کی وہ کالی کالی خوفناک باچھیں! —— بھئی مجھے معاف کرو۔ میں نہیں آنے کا!

———+———

# روشندانوں کے شیشے

یہی — کٹی ہوئی نیندیں — یہی — فسردہ دلی
میں سوچتا ہوں کہ سب کچھ لٹا کے کیا پایا

# گرداب

اندھیرے کمرے میں میرا دم گھٹنے لگا کھڑکی کھول کر باہر جھانکا اندھیرے آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ ناچ رہے تھے اور دور کسی بالاخانے کے روشندانوں کے شیشے چمک رہے تھے۔ کوئی وہاں جاگ رہا تھا اس وقت میٹھی نیند کو قربان کرنے والا یا کوئی بیمار ہو گا یا کوئی ...... اور یہاں میرے خیالات اچانک رک گئے۔ اس سے آگے مجھے جو بات سوجھی اس نے مجھے کھڑکی کو بند کرنے اور بستر میں دبک جانے پر مجبور کر دیا۔ مگر اب تو آنکھوں میں جیسے کسی نے چٹکی بھر ریت ڈال دی ہو!

مدت کی بجھی ہوئی راکھ میں کوئی چنگاری چھپی ہوئی تھی کہ میرے چھیڑنے سے اچانک بھڑک اٹھی! میں نے تکیہ کو دوہرا کر کے سر تلے رکھا اور سوچنے لگا کہ:-

اونچے اونچے گنبدوں والا کالج اپنے بڑے دروازے کے پٹ کھولے ایک نو وارد کی آمد پر وقار اور خوشی سے جیسے پھیلا اور ابھرا جا رہا تھا۔ برآمدے میں کوئی لڑکا موجود نہ تھا کہ اس کے دفتر کا پتہ پوچھتا ایک ساڑھی پوش لڑکی نوٹس بورڈ کے سامنے کھڑی تھی میں نے جھجکتی

ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا آپ مجھے دفتر کا پتہ بتا سکیں گی؟"

"اوہ! خوشی سے۔" اس نے پلٹ کر کہا۔ "اس گیلری کے سرے پر کالج کا دفتر ہے۔ آپ نئے آئے ہیں شاید؟"

"جی ہاں۔"

"خوب۔"

میں کالج میں داخل ہو گیا۔ لیکن میرے پرانے لباس کی شکنیں میری سرخ ٹوپی کے گرد آلود کنارے اور میرے چہرے کی خشکی اور بے رونقی کالج کی محفلوں میں جی کھول کر حصہ لینے میں میری مزاحم رہی میرے قمیص کے کالروں کے آخری سرے دھل دھل کر اڑ گئے تھے اور سیپ کے بٹن ٹوٹ ٹوٹ کر آدھے بھی نہ رہے تھے۔ میرے بوٹوں کا اگلا حصہ تقریباً اڑ چکا تھا اور ان کے تسموں میں بیشمار گانٹھیں تھیں، کالج کی خوشنما گیلریوں، کشادہ ہالوں اور خنک کمروں میں اگر اس ہیئت کا نوجوان داخل ہو جائے تو اسے کون پوچھے گا! پورے دو ہفتے کسی نے مجھ سے بات نہ کی۔ چپ چاپ میں کمرے کی آخری بنچوں پر بیٹھا رہتا اور لیکچر کے بعد چپ چاپ باہر آجاتا۔ نوجوان سنٹوں اور کریموں کی خوشبوئیں بکھیرے میرے قریب سے گزر جاتے نرم ملائم ساڑھیاں میرے پہلو سے سرسراتی ہوئی نکل جاتیں۔ لیکن میری طرف کوئی دیکھتا نہ تھا۔ میں ایک کملایا ہوا پھول تھا جو شگفتہ پھولوں کے ڈھیر میں پڑا تھا۔ نہ مجھ میں رنگ تھا نہ بو! مجھے کون اٹھا کر

سونگھتا۔ اور کون بالوں میں سجاتا میں جب شہر میں اپنے تنگ و تاریک کمرے میں آتا اور بوسیدہ چٹائی پر کتابیں پھینک کر جھولاسی چارپائی پر دراز ہوجاتا تو سوچتا رہتا کہ میری زندگی کی دوپہر پر ابھی سے شام کی دھندلاہٹیں کیوں منڈلا رہی ہیں مجھے اس مدرسہ میں اتنا حقیر کیوں سمجھا جا رہا ہے۔ کیا میرے منہ سے دال کی اور بالوں سے سرسوں کے تیل کی بدبو آتی ہے۔ کیا میرا لباس شکن آلود ہے اور چہرے پر اس سن میں بھی جھریاں نمودار ہو رہی ہیں اس لئے؟ اتنے حقیر وجوہات کے اتنے زبردست نتائج؟

کچھ عرصہ کے بعد میں ان کے تمسخر کا نشانہ بن گیا۔ میں جدھر سے گزرتا مجھ پر پھبتیاں اڑتیں اور جہاں بیٹھتا ادھر ادھر دبی سرگوشیاں اور سرگوشیوں میں الجھے ہوئے بالوں اور میلے کپڑوں کے تذکرے، اور پھر — "گنوار ہے — جاٹ ہے — کالج کے نام پر دھبہ ہے! — بو آتی ہے — دماغ پھٹا جاتا ہے۔ اسے ہمارے اتنا قریب نہیں بیٹھنا چاہیئے — پلیگ کا چوہا — میرا جی متلا رہا ہے۔"

مجھے اپنے لڑکپن میں اس قسم کی باتیں سننے کا اکثر اتفاق رہا۔ اور مجھے معلوم تھا کہ انسان کی برتری اس زمانہ میں زرق برق پوشاک اور دمکتے چمکتے چہرہ پر موقوف ہے ہیں ان کی باتیں سن کر خاموش ہو رہتا اور سوچتا رہتا کہ دو سال گزارنے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح کٹ جائیں گے۔ کبھی تو گزر جائیں گے۔ یہ سال کبھی تو چھٹکارا ہوجائیگا۔ اس حبس سے۔

سہ ماہی امتحان کے دس بارہ دن بعد ہمیں پروفیسر صاحب نے پرچے واپس دیئے۔ اور صاف چہروں، اکڑے کالروں اور ریشمی ملبوس والے بانکے نوجوان یہ سُن کر بہت افروختہ ہوئے کہ میں ہر مضمون میں اول رہا ہوں، ایکا ایکی قریباً دو سو آنکھیں مجھ پر جم گئیں۔ اور میں سر جھکائے قمیض کے اس حصہ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہا جسے آج میں نے ایک ٹیڑھی سوئی سے نہایت بے ڈھنگے انداز میں سیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے میری بہت تعریف کی اور کہا کہ "اس نوجوان کے ان بوسیدہ کپڑوں اور پریشان بالوں کو دیکھ کر ماتھوں پہ بل نہ ڈالو۔ اگر تمہاری نظریں دُور رس ہیں تو اس کے دل و دماغ میں ان قوتوں کو دیکھو جو ایک دن اس کا نام چار دانگ عالم میں مشہور کریں گی۔ میری پیشگوئی ہے کہ یہ شخص بہت بڑا منصف ہوگا۔"

نصف سے زیادہ چہروں پر طنزیہ مسکراہٹیں تھیں اور دوسروں پر تعجب و حیرت کے جذبات۔ مجھے کسی نے داد نہ دی!

اس دن کالج کا وقت ختم ہو جانے کے بعد میں بنچ پر سے اٹھا تو کسی ابھری ہوئی میخ سے میرا پاجامہ اٹک گیا اور آدھ فٹ کپڑا پھٹ کر لٹکنے لگا۔ کچھ نوجوان ہنس دیئے۔ کچھ گھور کر باہر نکل گئے اور میں اپنا خشک بھونڈا گھٹنا چھپانے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ کمرہ خالی ہو چکا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس لٹکی ہوئی دھجی کا کیا انتظام کیا جائے کہ میرے کانوں میں آواز آئی۔ "کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ میری وہی ہم جماعت نفیسہ کھڑی تھی جس نے مجھے پہلے دن دفتر کا پتہ بتایا تھا۔

مجھ سے آج تک کسی ذی روح نے اتنے ترحمانہ انداز میں بات نہیں کی تھی۔ میں گھبرا سا گیا کیونکہ اس لڑکی کو دیکھنے سے میرا جسم جیسے سو گیا

میں نے کہا "بیحد شکریہ آپ کا۔ آپ کیا مدد کریں گی میری — میں ابھی گھر جا کر سی لوں گا اسے۔"

اور وہ اپنے بالوں سے ایک کلپ اتار کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "فی الحال اس سے اٹکا لیجئے۔"

میں شرما گیا۔ ان ملائم سنہری بالوں کا کلپ اس کھردرے خشک گھٹنے کو چھوئے ایں برداشت نہ کر سکا۔ میں نے کہا "وہ! آپ کیا کر رہی ہیں میں ہیں دفتر سے کوئی پن ون لے لیتا ہوں۔ آپ بالوں میں لگا لیجئے اسے۔"

کلپ اتارنے سے اس کے بالوں کی دو چار لٹیں ڈھیلی ہو کر اس کی پیشانی اور گالوں پر ساون کی گھٹاؤں کی طرح چڑھی آ رہی تھیں اس کے چہرہ پر سنجیدگی برس رہی تھی اور اس کی ساڑھی کا وہ پلّو جس نے اس کا سینہ ڈھانپ رکھا تھا۔ بہم لرز رہا تھا! میں نے کلپ لے لی اور دھجی میں اٹکا کر شکریہ ادا کیا۔ وہ مجھ سے پہلے کمرے سے باہر نکل گئی اور میں بینچ پر بیٹھ کر بہت دیر تک یہ سوچتا رہا کہ یہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ اجاڑ کھیتوں میں اچانک یہ نم آلود ہوائیں کیسے چلیں کہ سوکھے تنکے بھی ہرے ہو کر لہرانے لگے۔ یہ عین نصف شب میں کہاں سے ایک کرن جھلملائی کہ

آدھی رات پر دوپہر کا گمان ہونے لگا۔ یہ بوسیدہ پاجامہ، یہ میلا قمیص، یہ پھٹی ہوئی آستینیں، یہ پرانے بوٹ، یہ خشک بال، یہ سوکھا جسم، یہ بھوک اور افلاس، اتنا کملایا ہوا اور ہولناک پس منظر اور پھر اس کے مقابل اتنی حسین و جمیل تصویر! سفید ساڑھی، ملائم سنہری بال تاروں کی سی شفاف آنکھیں، کنول سا چہرہ اور وہ مرمریں گردن اور وہ گداز بانہیں۔ وہ انداز گفتگو، وہ حسین سنجیدگی، وہ دلربا رعنائی، میری زندگی کے افق پر بیشمار کرنیں جھلملانے لگیں۔ میری حیات کی پگڈنڈیاں سنہرے نور سے دھل گئیں۔ میری بستی جہاں ہر طرف سناٹا چھایا رہتا تھا۔ بنسریوں اور الغوزوں کی تانوں سے گونج اٹھی میری زندگی کے افق پر سے ایک قرص ابھرا اور ساری دنیا یوں جگمگا اٹھی جیسے سردیوں کی اندھیری راتوں میں یکایک چاند ابھرتا ہے۔

اب کالج میں مجھ سے باتیں کرنے والوں کی کمی نہ تھی میں جہاں سے گزرتا لڑکے میری طرف عقیدتمندانہ نظروں سے دیکھتے رہتے تھے۔ اور اپنے دوستوں سے کہتے تھے "یہ راشد ہے نا؟ ہر مضمون میں اول رہا ہر اب کے ——" خوب، خوب! آوازیں آتیں اور برآمدے میں جاتے ہوئے یوں محسوس کرتا جیسے مجھے کوئی شاہی رتھ پر سوار کئے خوشبوؤں اور خوابوں کی دنیا میں لئے جا رہا ہو!

کمرے کے بائیں جانب لڑکیوں کی کرسیاں تھیں۔ جب ہم لکچر سن کر کمرے سے باہر نکلتے تو میں ایسے موقع کی تلاش میں رہتا کہ

نصیرہ کو کلپ واپس کر سکوں، لیکن وہ اپنی سہیلیوں میں گھری چلی جاتی اور میرے سینہ میں میرا دل اور میری جیب میں ان کا کلپ تڑپتے رہ جاتا

انھیں دنوں میں کالج میں ایک عظیم الشان مباحثہ ہوا۔ میرا نام مقرروں کی فہرست میں شامل نہ تھا لیکن خفیہ خفیہ تیاریاں کرتا رہا اور جب دو چار مقرر باقی رہ گئے تو میں نے پریسیڈنٹ کے پاس اپنے نام کی چٹ بھیج دی۔ پریسیڈنٹ نے اٹھ کر اعلان کیا کہ مسٹر راشد بھی تقریر کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہاوس اجازت دے تو وہ اسٹیج پر تشریف لے آئیں "ضرور ضرور" نوجوان چیخ اٹھے۔ اور میں تالیوں کے طوفان میں اسٹیج پر چڑھا۔ کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ نوجوان بڑی بیتابی سے میری تقریر کے منتظر تھے۔ ایک طرف لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ میری لڑکھڑاتی ہوئی نظریں ان پر سے گزریں ایک کرن سی جھلملائی، اور میرے لب آپ سے آپ ہلنے لگے۔ آہستہ آہستہ میری آواز ابھرنے لگی۔ میرے دماغ پر جادو سا چھایا جا رہا تھا طوفان کی طرح میرے الفاظ گونجنے لگے۔ میں نے مخالفین کے دلائل کی دھجیاں بکھیر کر رکھدیں۔ میرے ہاتھوں کے اشاروں اور چہرے کی رنگت کے اتار چڑھاؤ نے میری تقریر پر سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ میں جیسے اس منقش چھت کو ساتھ لے کر اوپر نکل جاؤں گا! میں گرجتا رہا اور آخر ان الفاظ سے تقریر ختم کی "میں اپنی تقریر کے لفظ لفظ حرف حرف کو اس

قوت کے نام معنون کرتا ہوں جس نے میری ناتوانیوں کو سہارا دیا۔ اور میرے اندھیرے دل میں اپنا نور کچھ ایسی شان سے برسایا کہ دو جہاں کے اسرار کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے آموجود ہوئے۔ مجھے اپنی اس تقریر پر فخر ہے اور میں چیلنج کرتا ہوں کہ کوئی شخص میرے ان دلائل کو میری سامنے آ کر جھوٹا کر دکھائے"!

مبہوت مجمع مجھے اسٹیج سے اترتے ہوئے دیکھنے لگا اور جب اپنی جگہ پر بیٹھتے وقت میں نے لڑکیوں کی بنچوں پر نظر ڈالی۔ تو نصیرہ اپنی گردن بڑھائے مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہماری نظریں لڑیں تو وہ حواس باختہ سی ہو گئی اور ایک موٹی سی لڑکی کے پیچھے چھپ گئی۔

میں مسرت سے ہانپنے لگا۔

کہاں وہ راشد جس پر پھبتیاں اڑانا نوجوانوں کا خاص مشغلہ تھا اور کہاں یہ راشد کہ جدھر سے گزرتا لڑکے بڑھ بڑھ کر سلام کرتے ہر ایک کی کوشش یہی ہوتی کہ راشد مجھ سے بات کرے۔ میں ہر ایک سے مصافحہ کرتا رسمی شکریہ ادا کرتا اپنے کمرے میں چلا جاتا اور میرے پیچھے دیر تک لڑکوں میں میری علمیت اور قوت بیان کے متعلق سرگوشیاں ہوتی رہتیں۔

ایک روز میں کالج کے باغیچے میں ایک روش پر ٹہل رہا تھا کہ دوسری روش پر نصیرہ آتی ہوئی دکھائی دی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بولی "کیا حال ہے مسٹر راشد؟ مجھے آپ کی پے بہ پے کامیابیوں سے بہت مسرت ہوئی ہے۔ حقیقت میں مجھے اور سب لوگوں سے زیادہ خوشی

ہوتی ہے آپ کی کامرانیاں دیکھ کر۔"

میں نے کہا بہت شکریہ آپ کا۔ بہت مہربانی۔ اور یہ آپ کا کلپ ..... "میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر کلپ موجود نہ تھا۔ "اوہ! گھر چھوڑ کر آیا ہوں آج۔ میں ہر روز کلپ ہمراہ لاتا رہا کہ پیش کر دوں۔ لیکن اتفاق سے آپ مل نہ سکیں" اور آج میں ......"

"کوئی بات نہیں!" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "کلپ میں ایسی کیا خصوصیت تھی کہ آپ اسے اتنے دنوں اٹھائے پھرتے رہے۔ میری طرف سے اپنی بیگم کو نشانی دیدی ہوتی۔ وہی بالوں میں ........"

"میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

"اچھا!" نصیرہ نے تعجب سے کہا۔ "میں بھولی۔ گڈ ڈے!"

"گڈ ڈے!" — میں نے گھبرا کر اپنا سینہ ملا۔ سینہ کی جیب میں کوئی چیز ٹیڑھی محسوس ہوئی۔ میں نے اسے ٹٹولا۔ یہ نصیرہ کا کلپ تھا۔ میں پکارا۔ "آپکا کلپ ....." لیکن وہ میری شادی کا ذکر سن کر کچھ ایسی گھبرائی تھی کہ اس کے قدموں میں برقی سرعت بھر گئی تھی۔ وہ اب گیلریوں میں داخل ہو چکی تھی میں کلپ کو انگلیوں میں گھماتا رہ گیا۔

نصیرہ جو کالج میں اکثر کھاتے پیتے نوجوانوں ہی سے رغبت رکھتی تھی اور جو خود ایک لکھ پتی کی لڑکی تھی ایک مفلس اور قلاش نوجوان کی طرف کچھ اس طرح جھکی کہ اکڑے ہوئے کالروں اور لہراتی ہوئی نکٹائیوں والے نوجوان بھونچکا سے رہ گئے۔ سب مجھے غاصب تصور کرنے لگے۔ وہ نصیرہ کو

پھانسنے کے لئے ایسی ایسی تجویزیں کرتے تھے کہ اگر نصیرہ کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ لیکن اس کے رویّہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ کالج شروع ہونے سے پہلے میرے ساتھ باتیں کر رہی ہے۔ کالج کے دوران میں صرف مجھ سے مطالعہ کی کتابوں کے متعلق مشورے ہو رہے ہیں! کالج ختم ہونے کے وقت صرف مجھ سے الوداع کہی جا رہی ہے۔ یہ دیکھ کر لڑکوں کا رویہ بالکل تبدیل ہو گیا۔ اور کالج کے اولین ایام کی طرح مجھ پر پھبتیاں کسی جانے لگیں۔ "کوا ہنس کی چال چل رہا ہے۔" "پہلوڑے حور میں لنگور.....!" لیکن میں یہ سب کچھ سن کر مسکراتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ اور وہ میری بے نیازی دیکھ کر کلیجے مسوس کر رہ جاتے۔ ایک کنگلا جو اپنے ضلع کے ڈسٹرکٹ بورڈ سے خیراتی وظیفہ حاصل کر کے تعلیم پا رہا تھا! ایک لکھ پتی کی مغرور اور حسین و جمیل لڑکی سے محبت کرے اور پھر ایسی کامیاب محبت! ایسا نڈر ہو کر۔ جو سنتا حیران رہ جاتا۔

نصیرہ اور میں دونوں یہ باتیں محسوس کرتے تھے لیکن ہماری زبانوں پر کبھی گلہ نہ آیا۔ نہ ہم نے کبھی اظہار محبت کیا۔ رسمی گفتگو کے پردے میں چپکے چپکے نہایت خاموشی سے ہم ایک دوسرے سے پیار بھری باتیں کر لیتے تھے۔ لیکن وہ باتیں زبان کی شرمندۂ احسان نہ تھیں۔ دل کی دھڑکن، آنکھوں کی چمک، انگلیوں کا رعشہ اور پھر گفتگو کے مختلف موضوعات "سلطان علاؤالدین اور پدمنی کا قصّہ کس مؤرخ نے گھڑا ہی؟" "کیا سلطان محمود کے ساتھ ایاز بھی ہندوستان میں آیا تھا؟" باز بہادر

اور روپ متی کی داستان کہاں تک صحیح ہے؟" "کیا جہانگیر کے عقد میں آکر نور جہاں نے شیر افگن سے بیوفائی نہ کی"۔ ان سوالات کے پیچھے ایک پتلے سے آبی دوپٹے سے ڈھکی ہوئی معصوم محبت رقص کرتی رہتی اور اس کے خلخالوں اور ٹخنوں کے گھنگروؤں کی جھنکار۔ اس کے کانوں کی نیلم اور یاقوت سے تراشے ہوئے آویزوں کی چھم چھم! اس کی چاندنی میں ڈھلی ہوئی باہوں کا دلآویز لوچ اور اس کی مرمریں گردن کا دلربا خم کون جانتا تھا کہ پروفیسر کی مادی اور ٹھوس تقریر سننے والوں میں دو ایسی ہستیاں بھی موجود ہیں جو ان خوفناک سنگین حقیقتوں کی نعش پر چڑھ کر ایک ایسی دنیا کو دیکھ رہی ہیں جہاں خوشبوؤں اور نیندوں کے سوا اور کچھ نہیں۔

ہم بی۔ اے کے امتحان سے فارغ ہو چکے تھے اور آج اپنے اپنے گھروں کو جانے کا دن تھا۔ شہر سے باہر دریا کے اس طرف ایک ننھا سا ریگستان تھا جہاں راتوں کو ایک ایسا سناٹا سرسراتا رہتا تھا کہ لوگ اس جگہ کو پریوں اور چڑیلوں کی آماجگاہ سمجھ کر اس طرف کا رُخ کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ انھیں ٹیلوں کی آڑ میں میں نے اور نصیرہ نے چند ایسی راتیں گزاری تھیں کہ آج بھی مجھے ان کے تصوّر سے انگڑائیاں آنے لگتی ہیں۔ آج رات بھی نصیرہ کو دریا کی سیر کے بہانہ سے ادھر آنا تھا یہ ہماری جدائی کی رات تھی اور ساری کائنات چپ چاپ دم سادھے کھڑی تھی۔ جیسے گزری ہوئی راتوں کے خواب دیکھ رہی ہے۔

میں دو ٹیلوں کے درمیان ٹھنڈی ریت پر بیٹھا گاہے گاہے بہت دور سڑک کی طرف دیکھتا تھا کہ شاید کوئی آتا ہوا نظر پڑ جائے! پچھلی رات کا چاند ابھی ابھی ابھرا تھا۔ زرد اور بے رونق کمزور اور ناتواں جیسے ابھی سامنے دریا میں گر جائے گا۔ بہت بڑے شہر کی سڑکوں کی روشنیاں دھندلاہٹوں میں لپٹی ہوئی جیسے سوچ رہی تھیں کہ آج کیا ہونے والا ہے؟

"جانے آج کیا ہونے والا ہے" میں نے ریت پر لوٹتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔

"ایک بہت بڑا انقلاب!" کوئی پاس ہی سے بولا۔

میں تلملا کر اٹھ بیٹھا "نضیرہ!"

وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا اور ایک ہاتھ میں چنبیلی کے دو پھول تھے جو اس کی انگلیوں میں پیہم گھوم رہے تھے۔ آنکھیں نیم وا کئے ذرا آگے جھک کر اس نے کہا۔ "راشد! زندگی اگر ہمیشہ ایک ہی پگڈنڈی پر گامزن رہتی۔ ہمیشہ ایک ایسے خطوں سے گزرتی تو کیسا مزہ آتا۔ یہ بہار و خزاں کے جھگڑے جانے کس لئے کھڑے کئے گئے۔ یہ فراق و وصال کی الجھنیں جانے کیوں پیدا کی گئیں مجھے تو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ ہمیں کبھی بچھڑنا بھی ہوگا میں سمجھی ہماری راہ ہمیشہ یونہی ہموار رہے گی اس گاڑی میں کوئی روڑا نہ اٹکے گا۔"

میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ آج تم آتے ہی گہری گہری

باتیں کرنے لگیں زندگی کا معمہ کون سمجھ سکتا ہے نصیرہ! ازل سے یونہی ہوتا آیا ہے۔ کون جانے اب ہماری راہ میں کتنی سنگین چٹانیں۔ کیسے خوفناک جنگل، کس قدر دشوار گزار کوہسار حائل ہوں گے۔ ہو سکتا ہے ہم پھر کبھی نہ مل سکیں ہر شخص کا الگ الگ رستہ ہے۔ کہیں کہیں یہ رستے ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ ہمارے راستے نزدیک ہونے کے بجائے ایک دوسرے سے دور ہوتے جائیں! اور ہم ایک دوسرے کو دیکھنے کے لئے ترستے رہ جائیں۔ نصیرہ! کبھی کبھی یہ یہ خیال میرے دل میں کھٹکتا ہے کہ ایک محتاج اور ایک ذی جاہ کی محبت کا انجام خوشگوار ہونا ناممکن ہے، آج یہ خیال یقین میں بدلا جا رہا ہے۔"

نصیرہ بیتاب ہو کر بولی۔ "تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ میں نے تعلیم اس لئے حاصل نہیں کی کہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ جاؤں جو میرے احساسات کو نہیں سمجھ سکتے۔ جو اس دنیا کا تصور تک نہیں کر سکتے جو میری روح کی خلوتوں میں بس رہی ہے۔ راشد! تم باور کرو۔ میری محبت پانی کا بلبلا یا شفق کی سرخی نہیں کہ آن میں ابھرے اور مٹ جائے۔ میں......"

"لیکن تم کیا کر سکتی ہو؟" میں نے درمندانہ اشتیاق سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

میں بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ میں تمہیں کائنات کے تاریک ترین گوشہ میں بھی تلاش کر سکتی ہوں۔ میں ہزاروں کوس پر بیٹھی ہوئی

تمہیں مس کر سکتی ہوں۔"

"اچھا!" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "ایران کے صوفی شعرائے تمہارے دل پر بہت اثر کیا ہے۔"

اس سنجیدہ گفتاری میں یہ مزاحیہ فقرہ نصیرہ کو چبھا۔ اس نے میرے کاندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ اس کی آنکھیں اب ڈبڈبا آئی تھیں اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ "تمہیں یقین نہیں آتا؟ تم ہنستے ہو۔"

میں برداشت نہ کر سکا۔ میں نے کہا۔ "میں یقین ہی کر لوں" "مگر نصیرہ! تم ماں باپ کے بس میں ہو، تم اپنے رشتہ داروں کے بس میں ہو۔ تم آزاد نہیں۔ تم وہ چڑیا ہو جو ایک بہت کشادہ قفس میں بند ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس کی پروازوں میں کوئی چیز حائل نہ ہو گی۔ لیکن بیچاری معصوم جان کو نہیں معلوم کہ ایک دن آہنی سلاخیں اس کی راہ روک کر کھڑی ہو جائیں گی۔ اور وہ بے بس ہو کر وہیں اپنی زندگی کی باقی گھڑیاں گزار دے گی۔"

نصیرہ وفورِ جوش سے ابھر گئی۔ "اسکا یہ مطلب ہے کہ میری یہ چودہ سال کی محنت ریت میں مل کر رہ گئی۔" اس نے ریت کی مٹھی بھر کر آہستہ آہستہ نیچے گراتے ہوئے کہا۔ "راشد تمہارے متعلق پروفیسروں کو یقین ہے کہ تم پنجاب بھر میں اول رہو گے اور تمہیں اس کامیابی پر کم از کم کسی کالج کی پروفیسری تو ضرور سونپ دی جائے گی۔ اپنے مستقبل کے متعلق متفکر ہونے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں۔ اور میرے متعلق تم یقین رکھو چٹان کو

بارود سے اڑا دیا جائے تو اس کی جڑیں قائم رہتی ہیں۔ اور میرے اس وعدے کی سند یہ انگوٹھی ہے۔"

اس نے اپنی انگلی سے چاندی کی ایک انگشتری اتاری جس میں ایک خوبصورت ہیرا جڑا ہوا تھا اس نے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لاؤ پہنا دوں۔"

میں نے کہا۔ "مگر یہ تو میرا فرض تھا۔"

بولی۔ "ابھی تک تم رسموں کے چکر میں الجھے ہوئے ہو۔" اس نے انگوٹھی میری انگلی میں پہنا دی! اور چنبیلی کے دو پھول میری گود میں پھینک دیئے۔ میں نے کہا "اوہ! یہ تو پھول نکلے میں سمجھے بیٹھا تھا کہ تم......"

"آسمان سے ستارے توڑ لائی ہو۔ تم یہی کہنے والے تھے نا۔"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔ چاند اب افق سے نیزہ بھر اونچا ابھر آیا تھا گول ٹیلوں پر زرد چاندنی برس رہی تھی۔ دریا کی ہلکی ہلکی گونج سے فضا سرسرا رہی تھی۔ سڑک پر گاہے گاہے کوئی موٹر روشنی کی دو طویل ندیاں بہاتی ہوئی کہیں گم ہو جاتی۔ ہم دونوں نے اپنے مایوس دلوں میں زبردست امیدوں کی گنجائش پیدا کر لی تھی اور جب ہم شہر کو واپس ہوئے تو ہم محسوس کر رہے تھے جیسے یہ جدائی عارضی ہے، اور جیسے کچھ دنوں میں پھر یہ چاندنی راتیں میرے شعروں اور نصیرہ کے گیسوؤں کی خوشبو سے معمور ہو جائیں گی۔

میں نے اپنے ضلع کے صدر مقام میں رہائش اختیار کر لی۔

نصیرہ کے خطوط آتے۔ مجھے ان کا ہر نقطہ دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ان کے حرف حرف میں ایک زندگی تھی۔ عزم تھا، استقلال تھا۔ اور میں خاموش راتوں میں موم بتی جلا کر ان خطوط کا مطالعہ کرتا رہتا۔ اور حیران ہوتا کہ خُدا نے مجھے اتنے بُرے ماحول میں رکھ کر ایسا پاکیزہ ساتھی کیسے عطا کر دیا!

بی۔ اے کا نتیجہ نکلا۔ میں پنجاب بھر میں پانچویں نمبر پر تھا۔ اخبارات میں میری تصویریں چھپیں۔ لوگ مجھے مبارک باد کہنے آئے۔ میں خوشی سے پھولا جا رہا تھا۔ نصیرہ بھی فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئی تھی اور میں منتظر تھا کہ نصیرہ کے خط کے ہمراہ کسی کالج سے بھی کوئی حکم نامہ آ نکلے گا۔ کہ یہاں آ کر پروفیسری کا قلمدان سنبھالو۔

نصیرہ ان دنوں کوئٹہ میں تھی۔ اس کے خطوط کا سلسلہ برابر جاری رہا اس نے ایک بار نہایت بیباکانہ انداز میں یہ بھی لکھا کہ وہاں ایک نوجوان نے اس پر ڈورے ڈالنا چاہے۔ مگر اس نے اس بدقماش کو کچھ ایسا ٹھکرایا کہ اب کبھی بھولے سے بھی وہ اس کا نام نہیں لیتا۔ میری امیدیں اور بڑھ گئیں اب نصیرہ کی طرف سے میں بالکل ہی مطمئن تھا۔

اس عرصہ میں مختلف محکموں میں مختلف جگہ بے شمار اسامیاں خالی ہوئیں مگر میری درخواستوں کو کسی نے نہ پُوچھا۔ میں بلندیوں سے آہستہ آہستہ گرتا رہا۔ سُرخ رنگ کی روشنائی سے جلی حروف میں لکھے ہوئے "ڈویژن" کو کسی نے نہ دیکھا۔ "پنجاب بھر میں پانچویں نمبر پر رہا!" — یہاں بھی کسی کی نگاہیں نہ رک سکیں۔ بدقسمتی سے میرے والد صاحب خان بہادر تھے

نہ بہت بڑے جاگیردار، ان سے تو پٹواری بھی منہ پھیر کر چلتے تھے میں نے مایوس ہو کر ضلع کچہری میں کلرکی کی درخواست دیدی۔ کسی نرم دل نے رحم کھا کر میرا نام منظور کر لیا اور میں پچیس روپیہ ماہوار پر ایک مجسٹریٹ کے دفتر میں کام کرنے لگا۔

نصیرہ کو میں نے اس "کامیابی" کی اطلاع نہ دی۔ کیونکہ وہ بہت حساس واقع ہوئی تھی۔ میں اسے اپنی کوششوں کے متعلق لکھتا رہا اور وہ لمبی لمبی دعاؤں سے اپنی بے پایاں محبت کا اظہار کرتی رہی۔

۸ر اگست کو مجھے نصیرہ کی چٹھی ملی کہ وہ ۱۲ر ستمبر کو کوئٹہ سے لاہور جاتے ہوئے یہاں سے گزرے گی اور یہ کہ ایک رات کے لئے یہاں اترے گی۔ کیونکہ وہ بالکل اکیلی ہوگی۔ نیز وہ اس عرصہ میں ایک خط اور بھی لکھے گی

اگر ایک حاکم کے کمرے میں ناچنا اور گانا ممنوع نہ ہوتا۔ تو میں پاگلوں کی طرح کرسیوں اور میزوں پر کود کود کر ان خوشیوں کا اظہار کرتا جو میرے دل سے چھلکی پڑتی تھیں۔ میں نے ۸ر اگست سے اپنے بالاخانے کی صفائی شروع کر دی۔ روشندانوں کے شیشے صاف کئے۔ چھت پر سے جالے اتارے۔ بازار سے طغرے خرید لایا جن میں اقبال غالب اور جوش کے زندگی افروز اشعار لکھے ہوئے تھے۔ پچیس روپیہ کے ایک کلرک نے اپنی بساط سے بڑھ کر اپنی کٹیا کو سجایا۔ سیڑھیوں کی گرد جھاڑی۔ کمرہ کے کونوں سے چٹکیاں بھر بھر کر خاک باہر پھینکی۔ پرانی کتابیں بکس میں چھپا دیں دو چار خوبصورت کتابیں خرید کر الماری میں سجائیں اور اپنے کپڑے خود

دھونے کے بجائے دھوبی سے دھلوائیے!

نصیرہ کے دوسرے خط کا میں منتظر رہا۔ مگر ۱۱ ستمبر تک کوئی خط نہ آیا۔ میں نے سوچا اتنے لمبے سفر کی تیاریوں میں فرصت نہ ملی ہو گی اور جب آمد کی تاریخ مقرر ہے تو ایسی پریشانیوں کے کیا معنیٰ؟

رات کے نو بجے تھے میں نے آخری بار اپنے بالاخانے پر نگاہیں دوڑائیں۔ لالٹین جلا کر میز پر رکھ دی۔ دروازہ مقفل کر کے اسٹیشن پر آ گیا۔ ہتھیلیوں اور تلووں سے اس قدر پسینہ پھوٹا کہ جیسے ابھی بیہوش ہو جاؤں گا۔ بیٹھے بیٹھے دل اچانک اس قدر سرعت سے دھڑکتا جیسے پسلیوں کو توڑ کر باہر آ گرے گا۔ دماغ میں ایسی گونج اٹھی جیسے بہت بڑی بلندی پر سے آبشار گر رہا ہے! سگنل ہوا۔ انجن کی چمکتی دمکتی آنکھ اندھیرے میں ابھری۔ آہستہ آہستہ اسٹیشن پر سفید روشنی کی لہریں بہنے لگیں۔ میرا دل پھیلتا گیا۔ انجن اسٹیشن کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ دھکا دھک۔ دھکا دھک۔ میرا دل پہیوں کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر دھڑک رہا تھا۔ چھکڑے ایک ایک کر کے گزرنے لگے۔ انجن کی دھکا دھک کم ہوتی گئی۔ اور بیشمار چھکڑوں میں نصیرہ کو نہ پا کر میرا دل بھی ڈوبتا چلا گیا۔ آخر گاڑی رُک گئی میں آگے بڑھا۔ اچانک میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ "راشد صاحب" نصیرہ کی بہت ہلکی اور بھرّائی ہوئی آواز آئی۔ سکنڈ کلاس کے ڈبے کی ایک کھڑکی سے وہ سر نکالے بیٹھی تھی۔ میں دیوانوں کی طرح

اس پر جھپٹا۔ وہ مجھے خاموشی کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "راشد۔ راشد" اور اس نے آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑ دیں میرے گلے میں جیسے کسی نے پھندا ڈال دیا ہے اور دل میں جیسے کوئی دہکتا ہوا انگارہ کلبلا رہا ہے۔ میں نے مدھم آواز میں کہا "نصیرہ! اترو گی نا؟"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں ——— میری شادی ہو چکی ہے۔"

میں جیسے انجن کے پہیّوں کے لپیٹ میں آ گیا ہوں۔

میں دم بخود کھڑا اسے گھورنے لگا وہ بولی۔ "والدین نے مجھے ایک دیو کے حوالے کر دیا ہے۔ تمہاری پیشگوئی صحیح نکلی۔ میں اب یہاں نہیں اتر سکتی۔" وہ بے قابو ہو کر رونے لگی۔ میں نے کہا۔ "نصیرہ! نصیرہ!! گاڑی چلی جائے گی۔"

"ہاں" وہ بولی۔ "گاڑی چلی جائے گی ——— لیکن میں نہیں اتر سکتی میرے شوہر میرے ہمراہ ہیں۔"

میں نے اندر جھانکا۔ چھ فٹ کا ایک دیو پڑا خراٹے بھر رہا تھا اس کی لمبی لمبی مونچھیں اس کے آبنوسی گالوں پر بکھری ہوئی تھیں۔

"یہ میرے خاوند ہیں۔" نصیرہ بولی۔ "سرکار نے انھیں نواب کا خطاب دے رکھا ہے۔"

میں بے جان بت کی طرح نصیرہ کو دیکھتا رہ گیا۔"

"تمہاری کوششوں کا کیا بنا؟" نضیرہ نے پوچھا۔

"میں آج کل پچیس روپیہ کا کلرک ہوں ضلع کچہری میں۔"

نضیرہ کا چہرہ جو پہلے ہی غضب کا بے رونق ہو رہا تھا آناً فاناً میں فق ہو گیا۔ کاغذ کی طرح خشک اور سفید! مرجھائے ہوئے ہاتھ اس نے میری طرف بڑھائے اور بولی "لیکن یہ دنیاوی بندشیں ہیں راشد! ہمیں ان کی کیا پروا!"

میں نے محسوس کیا کہ اب ایسی باتیں کرنے کا وقت گزر گیا۔ میرے دل کو جیسے کوئی شکنجے میں ڈال کر قہقہے لگا رہا ہے!

انجن نے سیٹی بجائی "نضیرہ" میں بلکتے ہوئے پکارا "کیا تم نہیں اترو گی؟"

گاڑی کے پرلے سرے پر کھڑے ہوئے گارڈ نے میری طرف دیکھا اور سبز بتی ہلانے لگا۔

"نضیرہ!" میں پکارا۔

"راشد! مجھے وہ انگوٹھی واپس دے سکو گے؟" اس نے نہایت کوشش سے یہ الفاظ ادا کئے۔ میرا دماغ گونجنے لگا۔ اب گاڑی آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ میں نے کہا "ہاں لیجئے اب یہ انگوٹھی میرے کس کام کی۔ آپ ہی کا مال ہے۔"

اس نے مجھ سے انگوٹھی لے لی اور ہیرے پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔ "یہ میرے کام آئیگی۔"

میں سب کچھ سمجھ گیا۔ بھاگا۔ مگر اب نضیرہ کا شوہر آنکھیں ملکر اٹھ رہا تھا اور گاڑی بھی تیز ہو چکی تھی۔

دور تک وہ کھڑکی سے باہر سر نکالے مجھے دیکھتی گئی۔ اور جب اسٹیشن مسافروں سے خالی ہو گیا تو دور افق پر دو ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں مجھے ٹکٹکی باندھے تادیر گھورتی رہیں۔ میں بے بس ہو کر فرش پر بیٹھ گیا۔

اور جب میں واپس شہر آیا تو دور میرے بالاخانے کے روشندانوں کے شیشے.........!

# پگلی

"پرے ہٹاؤ جی ـــــ خدا کے لئے انھیں جیب میں ڈالو مجھے متلی ہو رہی ہے" ـــــ اور کیشب منہ پھیر کر رفیق کے اس ہاتھ کو پرے دھکیلنے لگا جس میں فرانسی کسبیوں کی ننگی تصویروں کا ایک پلندہ تھا۔

مگر رفیق ہنسے جا رہا تھا ـــــ "پگلے۔ تمہیں ان بے جان تصویروں کے نظارے کی تاب نہیں۔ لیکن جب ایک جیتی جاگتی حسینہ تمہارے پہلو میں ٹھونس دی جائے گی اور تمہیں کہا جائے گا کہ اس سے محبت کرو۔ اس سے پیار کی باتیں کرو۔ اس کے بالوں اور گالوں سے کھیلو اور پھر آج کے بعد ہمیشہ اس کے ساتھ رہو تو کیا کرو گے تم؟"

"میں شادی نہیں کروں گا" کیشب آتشدان میں لکڑیوں کو الٹنے لگا۔ "میں برہم چاری ہی اچھا ہوں۔"

رفیق تصویروں سے تاش کے پتوں کی طرح کھیل رہا تھا "لیکن اگر تم اس پست دنیا سے اس قدر بلند ہو تو ہر زبان کے ادب میں رومانی عنصر کے اس قدر دلدادہ کیوں ہو؟"

"میں ادب برائے ادب کا قائل ہوں۔"

"یعنی تم کتابیں صرف اس لئے پڑھتے ہو کہ کتابیں پڑھنے کے لئے لکھی جاتی ہیں"۔

"ہاں"۔

"تمہیں کوئی روحانی کیف یا جسمانی خمار محسوس نہیں ہوتا انھیں پڑھ کر ——؟"

"نہیں"۔

"لیکن تمھیں وہ نظم کیوں پسند ہے جس میں عورت کے لبوں کو پنکھڑیوں سے۔ آنکھوں کو ستاروں سے گالوں کو شفق آلود مرمر سے اور باہوں کو کنول کے لچکتے ہوئے ڈنٹھلوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ عورت ایک سپنا ہے۔ رنگین اور اچھوتا۔ ایک پھول ہے، خوبصورت اور معطر، ایک چاند ہے، بلند اور روشن۔ ایک آسمان ہے، وسیع اور باوقار —— یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ تم اس نظم کو اس قدر کیوں پسند کرتے ہو جس کے ہر نقطے پر عورت سوار ہی؟"

سُنا ہے کل کرکٹ کا ایک زبردست میچ ہونے والا ہے۔ رفیق تصویروں کا پلندہ اپنی جیب میں ٹھونس کر اٹھا۔ "کیشب بھئی! تم نرے اُلّو ہو۔ تم کاٹھ کے گدّے ہو خدا کی قسم! اول تو میرا خیال ہے کہ تم نے اپنے آپ پر ایک دبیز پردہ ڈال رکھا ہے۔ لیکن اگر تم نرے کیشب ہی ہو تو خدا حافظ ہے تمہارا —— تم زندگی میں ہر قدم پر منہ کی کھاؤ گے، اور مفلر لپیٹتے ہوئے بولا۔ "اب میں جاتا ہوں تم جانتے ہو

ہر ملاقات پر میں ایک خاص موضوع پر گفتگو کرنے کا عادی ہوں۔ آج کا موضوع تمہارے لئے ناپاک ہے اور میں کرکٹ کی باتیں کر نہیں سکتا عادت سے مجبور ہوں ـــــ تمہارا سگریٹ کیس کہاں ہے؟" اور سگریٹ سلگا کر دیا سلائی کو آتشدان میں پھینکتے ہوئے بولا۔

"اچھا! ـــــ رخصت!"

اور جب رفیق کے قدموں کی چاپ ہولے ہولے مدھم پڑتی ختم ہو گئی تو کیشب نے محسوس کیا جیسے رفیق کی جیب سے سب تصویریں ایک ایک کر کے اچھل پڑی ہیں اور اس کے کمرے کے روشندانوں، کھڑکیوں کے ریشمی پردوں، فرش اور دیواروں سے چپک کر رہ گئی ہیں، گھبرا کر اس نے آتشدان میں بھڑکتے ہوئے شعلوں پر نگاہیں گاڑ دیں۔ یکا یک ان شعلوں نے ایک ناچتی ہوئی فرانسیسی دوشیزہ کی صورت اختیار کر لی۔ برہنہ جسم، سنہرے بال پارے کی طرح کانپتے اعضا ـــــ اس کا دماغ چکرا سا گیا۔ آنکھیں جھکا کر اس نے اپنے آپ سے پوچھا "میرا سگریٹ کیس کدھر ہے؟" اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اٹھ کر کرسی کے نیچے جھانکا۔ غالیچے کا ایک کونا اٹھا رہا تھا کہ اس کے لبوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ تیر گئی۔ سگریٹ کیس اس کی اپنی مٹھی میں تھا۔ میز پر پڑے ہوئے رفیق کے فوٹو کی طرف دیکھ کر بولا۔ "بڑا شریر ہے تو!" لیکن ان الفاظ میں بلا کا پیار پوشیدہ تھا۔

اس رات اس کی نیندوں پر دوشیزاؤں کی جادو بھری مسکراہٹیں

برستی رہیں۔ اسے کائنات شفاف آنچلوں میں جکڑی ہوئی نظر آتی رہی اور آسمان و زمین کے درمیان پر اسرار خلاؤں میں اسے سڈول جسموں والی رقاصاؤں کی دلآویز تھرکنوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ صبح اُٹھا تو کھویا کھویا بستر کی چادر شکنوں کا انبار بن گئی تھی۔ دو تکیوں میں سے ایک فرش پر پڑا تھا اور ایک اس کے گھٹنے کے نیچے۔ اٹھ کر اُس نے آئینہ دیکھا اور پھر اپنے بے رونق چہرے پر ناک بھوں چڑھا کر بولا —— آج اشنان کرنا چاہئے —— سستی کی بھی حد ہوتی ہے آخر۔"

نہا دھو کر اُس نے کپڑے بدلے۔ قدِ آدم آئینے کے سامنے لباس کی ایک ایک شکن نہایت سلیقے سے درست کرتا رہا۔ دروازے سے آئینے تک کئی بار چل کر آیا تاکہ اپنے قدم اٹھنے کا اندازہ دیکھے اس روز سامنے جیب کا رومال تو کمبخت کسی پہلو سجتا ہی نہ تھا۔ اور عینک نگوڑی ناک کے بانسے تک ڈھلک آئی تھی۔ بن سنور کر وہ کمرے سے باہر نکلا۔ اس کی ماں مدت سے مر چکی تھی۔ بہن کا بیاہ ہو چکا تھا۔ برآمدے میں اس کے پتاجی بیٹھے رامائن پڑھ رہے تھے۔ انھیں پرنام کر کے وہ اپنے مکان کے بڑے گیٹ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے سڑک پر سے گرلز سکول کی لاری تیزی سے گزر گئی اور رفیق کی جیب سے تصویروں کا پلندہ جیسے باہر نکلا اور کسی ان دیکھے بگولے کی زد میں آ کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ کیشب کے دماغ میں فیروزی آنچل پھڑپھڑاتے رہ گئے اور دل یوں دھڑکنے لگا جیسے کوئی بچہ لوہے کے مکان میں

لوہے کی گیند اچھال رہا ہو۔

دراصل کیشب دنیا کی ہر لڑکی سے عشق کرنے کو تیار تھا لیکن اُس کا تجربہ محدود تھا۔ دریچوں میں کھڑی ہوئی لڑکیوں کی طرف کئی بار اُس نے اِس انداز میں دیکھا جیسے اس کی رٹی ہوئی ناولوں کے ہیرو دوشیزاؤں کو دیکھتے تھے۔ لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی وہ جب نگاہیں اٹھاتا تو پردے تیزی سے گر جاتے اور کھڑکیاں بند ہو جاتیں اور وہ لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کتابوں میں سے دوسرے ذرائع کی تلاش شروع کر دیتا۔ کئی بار اس نے سوچا کہ ان دھندلی دھندلی کھڑکیوں کی پرلی طرف کئی ہزار میاں بیوی خدا جانے کس کس انداز سے ایک دوسرے پر قربان ہو رہے ہوں گے۔ خُدا جانے ان مردوں نے ان لڑکیوں کو کیسے ورغلایا۔ کونسی کتاب پڑھی انھوں نے —— اور کئی بار تو کیشب سوچتا کہ اگر اسے وہ کتاب اپنی ساری جاگیر بیچنے پر بھی مل جائے تو وہ اسے ضرور خرید لے گا۔ وسیع زمینوں اور عالیشان کوٹھیوں سے ایک چلبلی البیلی لڑکی بہت —— بہت ہی زیادہ قیمتی ہے۔ سڑک پر سے گزرتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے یہ چہل قدمی کرتی ہوئی لڑکیاں صرف اسے شوق بھری نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔ لیکن جب وہ بے پروائی سے کسی اور سڑک پر مڑ جاتیں تو کائنات کے افقی کنارے سمٹنے لگتے اور کیشب کو اپنے سنگین دھندلکوں میں جکڑ لیتے اور وہ کیچڑ میں پھنسے ہوئے کیکڑے کی طرح خیال ہی خیال میں بیکار ہاتھ پیر مارتا رہتا

چند دنوں سے وہ لڑکیوں کے متعلق بہت سوچنا بند کر چکا تھا۔ اس نے ایک "کیرم بورڈ" خرید لیا تھا اور تمام دن اکیلا کمرے میں بیٹھا کیرم کھیلتا رہتا۔ اور جب کوئی خیالی حسینہ کیرم بورڈ کے ایک سرے سے سٹرائکر کو چٹکی سے اڑاتی تو اسے یوں محسوس ہوتا۔ جیسے کسی نے پستول کی لبلبی دبا دی ہے اور بیشمار گولیاں اس کے دل کو چھلنی کرتی اس کے کمرے میں سیٹیاں بجاتی تیرتی پھر رہی ہیں۔ کیرم بورڈ سے تھکا تو تاریخی کتابیں پڑھنے لگا۔ اور جب وہاں بھی علاؤالدین خلجی اور ——! باز بہادر اور —— جہانگیر اور —— ! کے قصوں سے مڈبھیڑ ہوئی تو جغرافیہ کی طرف پلٹا۔ لیکن ایک روز جب وہ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کی راجدھانیوں کے حالات پڑھ رہا تھا، تو اس کے دماغ میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ پیرس میں بڑی بڑی عالیشان رقص گاہیں ہیں جو فن معماری کے بہترین نمونے ہیں۔ ان عمارتوں میں آدھی رات تک برہنہ عورتیں ناچتی ہیں شراب لنڈھتی ہے۔ ساز بجتے ہیں اور بڑے بڑے لارڈ —— لارڈ یعنی بڑے بڑے جاگیردار! اور پھر کیشب بھی تو اچھا خاصا جاگیردار تھا، اس کے لئے بہت بڑی رقص گاہ نہ سہی، یہی تنگ سا کمرہ ہی کافی تھا لیکن کہاں پیرس، کہاں لاہور، کہاں راجہ بھوج کہاں گنگو تیلی! —— یعنی وہ گنگو تیلی تھا۔ خیالات کی یہ بے ہنگم زنجیر توڑنے کے لئے اس نے کتاب میز پر پٹخ دی۔ اور سگریٹ کیس کھول کر اکٹھے تین سگریٹ پی گیا۔ اسی شام کو رفیق نے اس آگ کو ہوا دے دی اور کیشب ناولوں کی

معلومات سے لدا پھندا قدم قدم پر ٹائی کو درست کرتا بسنت روڈ، میکلوڈ روڈ اور مال روڈ کے چکر کاٹنے لگا۔ ساڑھیوں میں رنگ و نور کے مجسموں کو لپٹا ہوا دیکھ کر اس نے پھر سگریٹ کیس پر حملہ بول دیا۔ اور جب لارنس باغ پہنچا تو اکّے دکّے مالیوں اور کالج کے چھوکروں کے سوا اسے اور کوئی انسان نظر نہ آیا۔ ایک خالی بنچ پر بیٹھ کر نئے محاذ قائم کرنے کی تجویزیں سوچتا رہا۔ اور جب سر اٹھایا تو گھاس کے سبز قطعوں پر میلہ سا لگا ہوا تھا۔ چار بج چکے تھے اور ریشمی ساڑھیوں میں لپٹی ہوئی ——— کیشب وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور باغ کے جنوبی راستے سے نکلتا سنٹرل جیل کی طرف چل پڑا۔ جیل کے شمال سے گزرتی ہوئی ویران سڑک پر پہنچ کر اس نے آس پاس گنجان درختوں کو دیکھا اور سڑک سے دور ایک شیشم کے نیچے جا گرا۔ اس کے جسم کے نیچے سوکھے ہوئے پتّے تالیاں بجا کر خاموش ہو گئے۔ اور کیشب پھر انہی بے ڈھنگی سوچوں میں ڈوب گیا

اچانک اسے سوکھے ہوئے پتوں کے چٹخنے کی آواز سنائی دی قریب ہی ایک اور شیشم کے نیچے ایک سانولی سی لڑکی پتوں کا ایک انبار لگا رہی تھی۔ اس نے سرخ رنگ کی کھدر کی ایک گھگری اور گلابی رنگ کی ایک میلی سی انگیا پہن رکھی تھی۔ تنگ ماتھا قدرے چپٹی ناک۔ بھرے بھرے گال اور سڈول بازو جھکتی تو گھگھری چھتری سی بن جاتی۔ اٹھتی تو جیسے تنگ انگیا پھٹ کر دھجیاں بن جائے گی۔ گاہے الٹے ہاتھ سے ناک رگڑتی۔ کان کھجاتی۔ آنکھیں ملتی اور پتوں کی ایک ڈھیری بنا کر آگے بڑھ جاتی۔

سیمنٹ کے دریچوں پر آہنی جنگلوں میں سے جھانکتی ہوئی اُن دوشیزاؤں کا تصوّر جھٹ کرنا پید ہو گیا۔ اور پیرس کی رقص گاہیں جھکولے کھاتی اینٹ اینٹ ہو کر بکھر گئیں۔ کیشب ذرا سنبھل بیٹھا۔ لیکن جب لڑکی نے اس شیشم کا رُخ کیا تو کیشب کا سنبھالا ڈگمگا گیا۔ جیب سے نوٹ بک نکال کر اس پر لکھنے لگا۔ "ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک دریا میں ایک ننھی سی مچھلی رہتی تھی ——" عظیم الشان ناولوں کے پلاٹ اسکے دماغ سے محو ہو گئے اور اس کے احساسات نے الٹی پھلانگ لگا کر اسے بچپن کے سبق دہرانے پر مجبور کر دیا۔ لڑکی تنے کے دوسری طرف پتے اکٹھے کرنے لگی تو کیشب کے دل کی دھڑکنیں خشک پتوں کی کھڑکھڑاہٹوں سے مل جل کر ہم آہنگ ہو گئیں۔ ایسا شور بلند ہوا۔ جیسے کائنات ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آپس میں بج رہی ہے۔

اور جب لڑکی اس کے سامنے آ گئی تو اس کی کنپٹیوں میں تناؤ سا پیدا ہو گیا۔ اور رگوں میں سُرسُریاں سی رینگنے لگیں۔

لیکن لڑکی بے توجہی سے پتّے اکٹھے کرتی جا رہی تھی۔ باہیں پھیلا پھیلا کر پتے سمیٹتے ہوئے اس کی انگیا ضرورت سے زیادہ تن جاتی اور جب گھومتی تو کولھے کپکپا اٹھتے۔ پتے سمیٹتی وہ کیشب کے بالکل قریب آ گئی اور بولی۔ "جرا پیر سکورلے بابو۔ پتے سمیٹ لوں۔"

"یعنی اسے میری پرواہی نہیں"، کیشب نے سوچا۔ مگر ایک شریف بچّے کی طرح پیر کھینچ لیے۔ لڑکی کے چہرہ پر دھول جمی ہوئی تھی اور تانبے کے

کڑوں میں دو چار پتے اٹکے ہوئے تھے۔ بال بیشمار ہینڈھیوں کی صورت
میں چوٹی پر ایک ننھا سا مینار بنا رہے تھے اور ــــ انگیا تنی ہوئی تھی
لڑکی پھر بولی۔ "جرا ادھر ہو جا بابو۔"

کیشب نے سوچا۔ "یہ چھوکری تو میری ہتک پر تل گئی ہے۔ یعنی
ان بیس تیس پتوں کو جو میرے سوٹ کو مٹی سے بچائے ہوئے ہیں۔
اس کی ڈھیری میں ضرور شامل ہونا چاہئیے!" ــــ بڑی ہمت کر کے
بولا۔ "لیکن ان تھوڑے سے پتّوں کو رہنے دے۔ میرے کپڑے خراب
ہو جائیں گے۔ اتنا ذخیرہ تو جمع کر لیا تو نے۔ ان مٹھی بھر پتوں کو کیا کرے گی
تو؟" کیشب گھبرا کر بہت سی باتیں ایک سانس میں کہہ گیا۔

"ایک وخت کی ہنڈیا پکے گی۔" وہ بولی۔

اچانک کیشب کو روس کے کسی افسانہ نگار کا ایک قول یاد آگیا
"پیسہ دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے۔" اور وہ جھٹ بولا۔ "ان پتوں کو
رہنے دے یہاں اور ــــ اور پیسے لے لے مجھ سے، لکڑی
خریدلیجیو۔"

لڑکی کے سانولے چہرے پر سرخی سی جھلکنے لگی۔ "پیسے؟"
اس نے پوچھا۔

اور کیشب جیب سے بٹوہ نکال کر بولا "ہاں۔ ہاں۔ پیسے لے"
اس نے ایک روپیہ نکال کر لڑکی کی طرف بڑھایا۔

"پر بابو ــــ" وہ اپنی بڑی بڑی چمکیلی آنکھیں جھپکانے لگی۔

"پر بابو۔ اِتنے بہت سے پیسے؟ اکٹھے؟" اور وہ گھٹنے ٹیک کر ہتھیلیوں کے بل آگے جھک کر بولی "تو بڑا دیالو ہے رے بابو" کچھ سوچ کر کہنے لگی "تو مکھول کر رہا ہے ہم سے!"

کیشب کا دل اس قدر پھیل گیا تھا کہ اس کی پسلیاں تنی ہوئی کمانیں بن گئی تھیں۔ نتھنوں سے ایک ساتھ دس دس سانسیں نکال رہا تھا اور اس کی رگوں میں سُرسُریاں زیادہ تیزی سے دوڑنے لگیں تھیں۔ بولا "مخول نہیں ——— ہے"۔

لڑکی کا منہ کھلا تھا۔ اور گرد آلود ہونٹوں میں مبہم سی لرزش پیدا ہو چلی تھی۔ یوں ہاتھ پھیلایا جیسے قسمت آزمائی کر رہی ہے۔ کیشب کے مٹھے کھنچ گئے روپیہ اس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے اس نے ہتھیلی کو انگوٹھے سے قدرے دبا دیا۔

لڑکی کی آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔ روپے کو انگلیوں کے پوروں سے چھوتی ہوئی بولی۔ "ارے!" اور پھر ہنسنے لگی "کھی کھی کھی کھی"۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ کیشب کے بالکل قریب کھسک آئی اور بولی۔ "تو کہاں رہتا ہے؟"

"شہر میں!" کیشب کا ماتھا تپتی ہوئی ٹھیکری بن رہا تھا۔

"سہر میں؟" وہ بولی۔ "ہوں ——— اچھا تو ——— تو تو سہر میں رہتا ہے؟" جیسے کوئی نہایت ضروری معاملہ اس کے پیش نظر ہے۔ "کتنی دور ہے یہاں سے؟"

"تین میل" کیشب جیسے دوسری جماعت کا امتحان دے رہا تھا
لڑکی اب خاموشی سے ایک پتے کو توڑ رہی تھی اور کیشب اس
کے گھگھرے کے بالائی کنارے کے ساتھ ساتھ نظریں دوڑا رہا تھا
لڑکی کی میلی مگر تنی ہوئی پلکوں کو دیکھ کر بولا۔ "کہاں رہتی ہو تم؟"
"یہاں"
"جیل میں؟" کیشب نے پوچھا۔
لڑکی کھی کھی ہنسنے لگی۔ "تو مکھول کرتا۔ ہے بابو! واہ واہ ——
جیل کے بھیتر دشمن جائیں میرے۔ باہر کوارٹوں کی صفائی کرتی ہوں"
اور وہ روپیہ اچھالنے لگی۔
"تمہارے ماتا پیتا؟"
"جل بسے کب کے۔ بڈھا سا چچا ہے۔ اس کے ہاں رات
گزارتی ہوں ——" اور روپیہ اب کے کیشب کی جھولی میں گر گیا
—— ادھر اس نے ہاتھ بڑھایا۔ اُدھر کیشب نے روپیہ جھولی میں
پڑا رہ گیا اور کیشب خوف اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے اس کا
کنگن گھمانے لگا۔ ناولوں میں پڑھے ہوئے طریقے وہ بھول گیا۔ اور
اس کے اندر چھپا ہوا کوئی احساس اسے یہ نئی راہ سمجھانے لگا۔ اس کا
ہاتھ ریپٹ کر لڑکی کی کہنی پر آیا۔ پھر پلٹ کر ہتھیلی پر ہتھیلی سے پھر کہنی کی
طرف لپکا اور اس کے بھرے بھرے کندھے تک ہو آیا یہ ریٹنا اور لپکنا چند
لمحے تک جاری رہا۔ آخر لڑکی بولی۔ "کوئی دیکھ لیوے تو؟"

"اندھیرے میں کون دیکھتا ہے پگلی؟" کیشب اپنے آپ کو دُنیا بھر کی ناولوں کا ہیرو سمجھ رہا تھا۔

"لیکن اب تو دن ہے۔"

"رات کو سہی۔"

"رات کو؟"

"ہاں ہاں رات کو — شام پڑے تک میں یہی رہوں گا۔"

"اچھا —!" اور روپے کو مٹھی میں دبا کر وہ اس تیزی سے جیل کی سمت چلی جیسے ہوا پر تھرکتی جا رہی ہے۔

کیشب سارا دن سنٹرل جیل سے لارنس اور لارنس سے سنٹرل جیل کے چکر کاٹتا رہا اور جب شام پڑی، کوؤں کے غول سرمئی فضا میں چیختے ہوئے اپنے بسیروں کو جانے لگے اور جیل کی گھڑیال نے سات بجائے تو اسے خشک پتوں کے ٹوٹنے کی آواز سُنائی دی۔ اور جب آواز بہت قریب آگئی تو وہ تنے کے اوٹ سے نکلا۔ "ٹیاؤں" ایک چیخ بلند ہوئی۔ ایک کمزور سی کتیا کا سایہ شیشموں سے لپکتا نہر کی طرف بھاگ گیا۔

کیشب کے دماغ میں بجلی کی روئیں سی چلنے لگیں۔ پورا ایک گھنٹہ اس نے ان روؤں کو دبانے کی کوشش میں گزارا اور جب جیل کے گھنٹہ نے آٹھ بجائے تو دور سڑک پر بجلی کی روشنی میں اسے ایک گھومتی ہوئی گُھگھری دکھائی دی۔ خشک پتے چٹخنے لگے اور کیشب کے

چاروں طرف خیالی رقاصائیں تھرکنے لگیں۔

"آگئی؟" اس نے قریب جا کر پوچھا۔

"ہاں!" وہ ہولے سے بولی۔"چڈّ۔ نہیں ملی۔ تیری قسم ٹھنڈ ہے ہمیں تو۔"

اندھیرے میں اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔"لیکن تو نے نام تو بتایا نہیں اپنا۔"

"دُرگی۔"

اور کیشب کو یوں محسوس ہوا جیسے دراصل اس نے دُرگی نہیں کہا۔"کلوپیٹرا" کہا ہے۔

سڑک پر ایک تانگہ مل گیا۔"کہاں کا مال ہے۔" کوچبان نے پوچھا اور کیشب اسے ڈپٹ کر بولا۔"ارے ٹٹو کو چابک دکھا۔"

"چابک بابو جی؟" کوچبان بولا۔"اسے ذرا چھو لوں تو ہوا میں اڑ جائے پوربی گھوڑی کا پٹھا ہے بابو جی! چابک دکھاؤں تو خدا کی قسم اُردو بولنے لگے۔"

لیکن کیشب کوچبان سے کچھ نہ بولا۔ چپ چاپ بیٹھا دُرگی کی کلائی میں کنگن گھماتا رہا۔ شاہ عالمی دروازے کے پاس دونوں اترے اور ایک اندھیری گلی میں گھس گئے۔ اپنے مکان کے قریب پہنچ کر کیشب دو چار لمحے گیٹ کے قریب دم سادھے کھڑا رہا۔ پھر بولا۔"دُرگی! میری جان ——— میں ابھی آیا ——— بس آنکھ کی جھپلی میں ——— تم اس

"جھاڑی" میں چھپ جاؤ ـــــ یہاں ـــــ اور دبک جاؤ ـــــ
یوں۔ بس ٹھیک ہے!"

لپک کر وہ مکان کے کھلے برآمدے میں آیا اس کا ایسیشن کُتّا
"گاشی" اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ اس کے پتا اپنے کمرے میں
سو رہے تھے اور مالی کی کوٹھڑی میں بھی دیا بجھ چکا تھا۔

کتّے کو برآمدے میں پرلے سرے پر بٹھا کر وہ درگی کو جھاڑی
میں سے اٹھا لایا۔ بجلی جلانے سے قبل کھڑکیوں پر پردے ڈال دیئے
اور جب بجلی جلی تو اس کی نظریں صوفے پر بیٹھی ہوئی درگی پر پڑیں نہائی
دھوئی دُرگی۔ ہونٹوں پر سُرخی۔ انگیا پر پُرانی گوٹہ کناری۔ وہی لال
کھدر کی گھگھری ـــــ انگلیوں میں روپیہ ـــــ تیز روشنی میں اس کا رنگ
بھی سفید نظر آنے لگا۔ الماری سے سینٹ کی شیشی نکال کر وہ اس کے قریب
صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے بالوں۔ انگیا اور گھگھری پر سینٹ چھڑک رہا تھا کہ
مالی کی کوٹھڑی سے کسی کے گانے کی آواز آئی ؎

لالو چمار کی نٹ کھٹ چھوری!
تیلہ بھی لگاوے جی پھیلا بھی لگاوے
قدم قدم پہ لٹ جھٹکاوے
مسکے ہے انگیا ری نگوری ـــــ ہائے رام رے

کیشب ہنسنے لگا۔ "بڑے مزے کا گیت ہے!"
"ہم بھی گاتے ہیں۔" دُرگی سینٹ کی خوشبو سے نیم بیہوش ہو کر بولی

"نہیں نہیں" کیشب نے اس کے بھرے بھرے گالوں پر ہلکا سا طمانچہ مار کر کہا "ہم یہاں گانے بجانے نہیں آئے ہے۔"

اٹھ کر اس نے بتی بجھا دی ـــــ اور جب پھر جلی تو کیشب کی آنکھیں سوج رہی تھیں۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور چہرے پر وحشت برس رہی تھی اور درگی کے سر پر مینڈھیوں کا مینار ایک طرف جھک گیا تھا۔ انگیا گلے میں لٹک رہی تھی اور گھگھری سے باہر گول پنڈلیاں پکے ہوئے پھل کی طرح جیسے دہک رہی تھیں۔

کیشب نے اٹھ کر انگڑائی لی اور بٹوے سے ایک روپیہ نکالکر بولا ـــــ "لے۔"

اب درگی کے ہاتھ میں دو روپے تھے۔ وہ خوش ہو کر دونوں کو بجانے لگی۔

"ارے پگلی ـــــ کھنکھنا مت! ـــــ ساتھ کے کمرے میں پتاجی سو رہے ہیں۔ اب جا!"

"کیا ـــــ؟"

"اب جا۔"

"رات تو یہیں گجاروں گی بابو! تین میل دور کیسے جاؤں۔ اس کڑاکے کے جاڑے یاں؟"

کیشب بھنّا گیا۔ لیکن اب تیرا یہاں کیا کام ـــــ مالکن بن بیٹھی گھر کی۔ دو روپئے تو لے لئے۔"

درگی کی آنکھیں جیسے پھٹ پڑیں --- انگیا اور گھگری کو ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔ "پر بابو گھر دور ہے جاڑا ہے، چدّر نہیں۔ رات گجارنے دو۔" اور پھر نہایت دکھ بھرے لہجہ میں بولی۔ "فجر دم چلی جاؤں گی۔"

لیکن کیشب کے تمام ولولے بھاپ کی طرح تحلیل ہو چکے تھے

دُرگی کو ڈپٹ کر بولا۔ "جاتی بھی ہے اب کہ" اور اس نے دُرگی کا بازو پکڑ لیا "نکل یہاں سے ---- کلموہی ---- چڑیل ---- پگلی ----!"

"پر بابو جی ----!"

لیکن کیشب اسے بازو سے گھسیٹ کر برآمدے میں لے آیا

"لے جا، بھاگ جا۔"

"پر بابو جی ----!"

اور کیشب نے اسے بینڈھیوں سے پکڑ کر برآمدے سے باہر ڈھکیل دیا۔ وہ دھپ سے منہ کے بل بجری پر جا گری۔ اچانک برآمدے کے پرلے سرے سے "گاشی" غرّاتا ہوا بڑھا۔ درگی خوفزدہ ہو کر اٹھی اور چیخیں مارتی سرپٹ دوڑی۔ گاشی اس کے پیچھے لپکا۔ چیخوں سے اندھیرا محلہ گونج اٹھا۔ کیشب تیزی سے پلٹ کر اپنے کمرے میں آ گیا ساتھ کے کمرے سے اس کے پتا کی آواز آئی۔

"کیشب ----"

"جی!" وہ رفیق کی تصویر دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"کیا کر رہے ہو؟"

"پڑھ رہا ہوں جی۔"

"یہ گاشی کس پر جھپٹا ہے؟ اور یہ چیخیں کسی عورت کی ہیں شاید۔"

"کوئی پگلی ہو گی پتا جی"

"ہوں — اس وقت سڑک پر گھومنے والی کوئی پگلی ہی ہو گی۔"

اور پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ صرف برآمدے میں گاشی کے پیروں کی ہلکی ہلکی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

صبح جب کیشب اٹھ کر باہر جانے لگا تو برآمدے کے باہر بجری پر خون کے چند دھبے اور دو روپے پڑے تھے اور گاشی لال کھدر کے ایک ہاتھ بھر ٹکڑے سے کھیل رہا تھا۔

—+—

# غریب کا تحفہ

میں نے اسے گاؤں سے باہر ایک کھنڈر کی جھکی ہوئی دیوار پر اپلے تھوپتے دیکھا۔ اُس نے مجھے ایک بار اچٹتی سی نظر سے دیکھا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ میں نے بھی اس پر یونہی ایک اڑتی سی نگاہ ڈالی اور آگے نکل گیا۔ اُپلے تھوپنا کوئی ایسا تعجب انگیز کام نہ تھا کہ میں ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا۔ اور اسے گھورنے لگتا۔ گاؤں کی ہر عورت صبح اٹھ کر نماز سے پہلے ہی کام کرتی ہے۔ میں وہاں سے سیدھا گھر آگیا۔

دوسرے روز میں منہ اندھیرے ہی گھر سے نکلا کیونکہ اس روز مجھے ایک بہت بلند چوٹی پر طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھنے جانا تھا میں گاؤں سے باہر نکلا تو ایک سایہ سا سر پر ٹوکری اٹھائے میرے آگے آگے رینگتا نظر آیا۔ میں نے یونہی پوچھ لیا۔ "کون ہے بھائی؟——

"جی میں ہوں"۔ یہ ایک عورت کی آواز تھی۔ میں خاموش ہو رہا۔

طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھ کر میں اسی رستے سے واپس ہوا تو اسی دیوار پر اپلے تھوپے جا رہے تھے۔ اس نے مجھے ایک بار دیکھا

اور اس کے دیکھنے میں کوئی ایسی خاص بات نہ تھی کہ میں رُک جاتا۔ میں چلتا گیا اور وہ سر جھکائے تھپا تھپ اپنے ہاتھوں کو تیزی سے جنبش دیتی رہی۔

اور یہ منظر میں نے صرف دو دن ہی نہ دیکھا۔ متواتر دس روز مجھے یہی لڑکی اُسی کھنڈر کے پاس اپنے کام میں مصروف نظر آتی رہی دسویں روز میرے دل میں خیال آیا کہ آخر یہ لڑکی اپنے گھر اپلے کیوں نہیں تھوپتی۔ یہاں بھیانک کھنڈر کی کمزور دیوار سے اسے کیا لگاؤ!۔۔۔۔۔۔ لیکن ان دنوں میں اپنی شادی کی تیاریوں میں کچھ اس شدت سے مصروف تھا کہ کسی ایک خیال کا مسلسل طور پر میرے دماغ پر مسلّط رہنا دشوار تھا۔۔۔۔۔ میں سیدھا اپنے گھر آ گیا۔

دوسرے روز میں علی الصباح اٹھ کر گاؤں سے باہر گیا تو وہ رستے میں بیٹھی گوبر اکٹھا کر رہی تھی۔ رستہ ذرا تنگ تھا۔ میں اس کے قریب آ کر رک گیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔ اور تیزی سے ایک طرف ہو کر بولی۔ "گزر جائیے جی۔"

میں نے ایک قدم اٹھایا مگر مڑ کر صرف اتنا پوچھ لیا "تم کس کی بیٹی ہو؟"

اُس نے پھٹی ہوئی چادر سینے پر پھیلا کر کہا۔ میں پردیسی ہوں جی میرے ماں باپ مر گئے ہیں۔"

میں نے پھر پوچھا۔ "کس کے اُپلے تھوپتی ہو؟"

بولی۔ اپنے جی۔ انھیں بیچ کر پیٹ بھرتی ہوں۔"
میں آگے نکل گیا۔ ایک بار مڑ کر دیکھا تو وہ ایک اور جگہ بیٹھی ٹوکری میں گوبر ڈال رہی تھی۔ میری کنپٹیوں کی رگیں قدرے پھول کر دکھنے لگیں اور دماغ کی نسوں میں ایک کھچاؤ سا پیدا ہو گیا۔ میں راہ کے ہموار ہونے کے باوجود ٹھوکریں کھانے اور ہانپنے لگا۔ واپسی پر میں نے اسے اسی دیوار کے پاس جھکتے اٹھتے اور پلٹتے دیکھا۔ اگلے روز وہ مجھے پھر اسی راستے پر ملی میں اس کے قریب آ کر رک گیا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ "آپ ہیں جی؟"
"ہاں" میں بولا۔ "بہت سویرے نکلتی ہو گاؤں سے!"
نظریں جھکائے ایک طرف ہو کر کہنے لگی۔ "سویرے نہ نکلوں تو دوسری لڑکیاں راہیں صاف کر جائیں اور میرا تو یہی روزگار ہے جی۔"
میں وہیں رک سا گیا۔ وہ ٹوکری اٹھا کر آگے جانا چاہتی تھی مجھے چپ چاپ کھڑا دیکھ کر بولی۔ "آپ صبح سویرے کہاں جاتے ہیں جی؟"
"سورج کے طلوع ہونے کا منظر دیکھنے۔" میں نے کہا۔
"اچھا جی!" اس نے یہ الفاظ یوں کہے گویا وہ میرا مطلب نہیں سمجھی۔
چار دن کے لئے مجھے گاؤں سے باہر جانا پڑا۔
پانچویں روز میں واپس آیا تو صبح سویرے اٹھ کر ادھر چل دیا۔ وہ بھینسوں کے ایک گلے کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی اچانک وہ گوبر اٹھانے کے لئے جھک گئی۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے پلٹ کر میری طرف

دیکھا اور اس کے لبوں پر اداس سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ بولی۔ "آپ کہاں چلے گئے تھے جی؟"

"پردیس میں کچھ کام تھا۔" میں نے کہا۔

وہ ٹوکری کو سر پر جما کر بولی۔ "میں چار دن آپ کی راہ دیکھتی رہی میں نے کہا اللہ خیر کرے ملک جی کیوں نہیں آئے! میں تو آج آپ کے گھر جانے والی تھی۔"

میرا دل دھڑک کر بجلی کی لہریں سی چھوڑنے لگا۔ جسم سن ہو کر رہ گیا۔ اور کانوں میں ایک مسلسل سی گونج پیدا ہو گئی!

بادلوں کے دو چار گول گول ٹکڑے مشرقی پربت پر منڈلا رہے تھے۔ ابھرتے ہوئے سورج کی لرزتی ہوئی کرنوں سے ان پر لمحہ بہ لمحہ گلابیاں دوڑی جا رہی تھیں۔ اور ان کے عکس خاموش وادی پر ارغوانی پردے سے پھیلا رہے تھے۔ گیہوں کے تازہ اگے ہوئے پودے اسکے بوجھ سے زمین پر جھکے جا رہے تھے اور دور بھینسیں چرانے والا گاموں مہینوال، ہمدردناک سروں میں ایک گیت الاپ رہا تھا:-

گجدیاں وجدیاں ہاٹھاں چڑھیاں

کِن کِن کنیاں دسیاں ل،

اس وقت میں نے لڑکی کو کچھ اس طرح دیکھا کہ وہ کانپ کر لجا گئی۔ اس کا رنگ پربت کی چوٹی پر منڈلاتے ہوئے بادلوں کا سا ہو گیا۔ اس کی گہری کالی آنکھوں پر پھیلی ہوئی نمی کی ہلکی سی تہ بھی

گلابی ہو گئی۔ اس نے جھک کر ٹوکری اٹھائی اور آگے جانے لگی مہینوال بہت دور جا چکا تھا۔ اور گاؤں کے آس پاس کوئی شخص نظر نہ آتا تھا۔ لڑکی کا کھلی آستینوں والا میلا چولا نرم نرم جھونکوں سے آہستہ آہستہ لہرا رہا تھا۔ اور جس بازو سے اس نے ٹوکری تھام رکھی تھی وہ شانے تک عریاں تھا ——— میں بے ارادہ اس کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ ایک گنجان جھاڑی کے پاس میں نے اسے جا لیا۔

اس کی آنکھوں میں خوف تھا اور ہونٹوں میں کپکپی۔ اس کے پریشان بال اس کے گالوں اور کانوں کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہے۔ وہ قریب ہی گول گول پتھروں کی دیوار سے چمٹ گئی اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "آپ ——— ملک جی آپ کیا چاہتے ہیں؟" ——— اس نے ٹوکری دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے جکڑ لی۔ اس کا دوسرا بازو بھی عریاں ہو گیا۔ میلی چادر سینے سے ڈھلک کر ایک طرف لٹکنے لگی اور اس کی سانسیں بہت تیز ہو گئیں۔

میں گھبرا گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اسے کیا کہوں ——— میں اسے کچھ کہنا ضرور چاہتا تھا۔ مگر میری زبان کوئی لفظ نہ ڈھال سکی۔ حلق میں پھندہ سا پڑ گیا۔ اور جھجک کر بولا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"خانی" اس نے یہ لفظ یوں کہا جیسے اس نے ایک بہت بھاری مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے!

میں واپس ہو پڑا۔ میں وہاں ٹھہر نہ سکا۔ میری نبضوں سے آنچ

اٹھنے لگی اور کان گونجنے لگے۔ میں گاؤں میں داخل ہوا تو نوجوان "مستری دینو" ملا۔ بولا "السّلام علیکم ملک جی۔ خیریت تو ہے؟ آپ کا چہرہ زرد ہو رہا ہے۔"

"خیریت ہے بھائی" ـــــ اور میں تیزی سے آگے نکل گیا۔ نوجوان زور سے کھا لنسا ـ ـ ـ کھا لنسی مصنوعی تھی! ـــــ میرے دل میں جیسے کسی نے چٹکی لی!

دن بھر میں چوپال پر نہ گیا۔ نمبر دار نے دو تین میراثیوں کے ذریعے کہلوا بھیجا کہ وہ لاہور سے نئے نئے ریکارڈ خرید لایا ہے اور تمام گاؤں صرف میرے انتظار میں چوپال پر اکٹھا ہے، لیکن میں نے کوئی بہانہ کر کے انھیں ٹال دیا۔ ابّا آ گئے۔ پوچھنے لگے "آج پڑھا کچھ نہیں؟" میں نے کہا۔ "جی سر میں درد ہے۔" آن کی آن میں انگریزی اور یونانی ادویات کا انبار میرے سامنے تھا ـــــ اُف والدین کی انجان محبّت!

شام کو میں چھت پر ٹہلنے کے لئے کمرے سے نکلا۔ دیواروں پر اپلوں کی قطاریں پڑی تھیں۔ بے ارادہ میری زبان سے یہ الفاظ نکل گئے "امّی۔ یہ اُپلے کس نے تھوپے؟"

"بیگماں نے اور کس نے؟"

"اچھا! بیگماں نے! ـــــ میں سمجھا کہیں سے خریدے ہیں!"

امی آنکھیں جھپکانے لگیں۔ بولیں "سر تو نہیں گھوم رہا تیرا؟ ـــــ اندر لیٹ جا کمرے میں۔ ہوا لگ جائے گی!"

لیکن میں شام کے اندھیرے میں گھر سے نکلا اور اسی کھنڈر کی طرف چلدیا۔ اُپلوں پر اپلوں والی کی انگلیوں کے نشان تھے جن پر میں اپنی انگلیاں پھیرتا رہا۔ سامنے اندھیرے میں مجھے میرے شہری دوست ہنستے نظر آئے اور پھر اسی اندھیرے سے ایک لڑکی سر پر ٹوکری اٹھائے اُبھری اور اسی اندھیرے میں گھس گئی!

گاؤں میں گھر گھر دیئے ٹمٹما اٹھے۔ میراثیوں کے گھر سے شہنائی کی آواز بلند ہوئی۔ کوئی نوخیز لڑکا شہنائی سیکھ رہا تھا! کھنڈر کی دیواریں تاریکی میں مل گئیں۔ اندھیرا اس قدر گہرا ہو گیا کہ مجھے اپنا وجود تک نظر نہ آتا تھا۔ میں نے اوپر دیکھا۔ آسمان پر بھیانک بادل گھر آئے تھے!

میں چپ چاپ سر جھکائے گھر کی طرف چل پڑا۔ میرے قدموں کی چاپ سے جھینگر بھی خاموش ہو گئے اور ہوا بھی جیسے ساکن ہو گئی، پگڈنڈی سے دور ایک کمہار کے گھر سے کتّا میری طرف جھپٹا اور میرا پتھر کھا کر ٹیاؤں ٹیاؤں چیختا لوٹ گیا!

دور کہیں بادل گرجے —— دور کہیں بجلی چمکی اور کھیتوں کی پرلی طرف سے کوئل کی آواز آنے لگی۔ ہوا سرسرانے لگی اور خوابیدہ جھاڑیاں اپنے پتے کھڑکھڑانے لگیں۔ پھوئیوں پھوئیوں مینہ برسنے لگا میں گھر کی طرف دوڑنے لگا!

اچانک میرے قدم آپ سے آپ رُک گئے۔ اور پھر میں پلٹ کر کھنڈر کی جانب دوڑا۔ میں نے سوچا غریب لڑکی کی ہفتوں اور مہینوں کی

محنت خاک میں مل جائے گی۔ اپلے بھیگ جائیں گے اور بیچاری فاقے کھینچے گی! جتنے اُپلے میں اندھیرے میں اکٹھے کر سکا کھنڈر کی بوسیدہ چھت کے نیچے رکھتا گیا۔ اسی اثناء میں مینہ چھاجوں پڑنے لگا۔ بجلی کی چمک بادل کی کڑک اور ہواؤں کی چیخوں سے اندھیرے میں ہنگامہ سا مچ گیا۔ لیکن میں خوش تھا۔ غم واندوہ کی دھند چھٹ گئی میں ٹھنڈی ہوا اور تیز پھوار کے سیلاب میں کود پڑا اور نہایت تیزی سے گاؤں کی طرف بھاگنے لگا۔

اچانک مجھ سے کوئی چیز ٹکرائی اور ساتھ ہی ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ میں کیچڑ میں سے اٹھتے ہوئے ادھر ادھر ہاتھ پھیرنے لگا کہ کہیں گرنے والا بیہوش تو نہیں ہو گیا۔ پہلے تو میرے ہاتھ بہتے ہوئے پانی میں تیرتے رہے۔ پھر اُن سے لمبے لمبے بال مس ہوئے۔۔۔ اور پھر ایک بھیگے ہوئے سڈول بازو پر ــــ میرا ہاتھ ایک جھٹکے سے پرے ہٹا دیا گیا اور خوفزدہ آواز آئی۔ "تم کون ہو؟"

یہ اُپلوں والی کی آواز تھی۔ میرا دماغ قلابازی سی کھا گیا۔

میں بولا "اندھیرا تھا خانی ــــ اور پھر میں کوئی غیر تو ہوں نہیں!"

تیز تیز سانسوں اور ٹھنڈے جھونکوں کی سرسراہٹوں میں کمہار کے کتے کی آواز گونجی جو شاید بادلوں پر بھونک رہا تھا ــــ خانی خاموش تھی۔

اچانک بادل زور سے گرجا اور بجلی اس شدت سے چمکی کہ کھلے بالوں اور بھیگے لباس والی حیران حسینہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں دو قدم آگے بڑھ آیا!

میں نے پوچھا۔ "اس طوفان میں کدھر بھاگی جا رہی تھیں؟"

"جی کھنڈر کی طرف"۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "جی میں نے ان تین ہفتوں میں جتنے اپلے تھوپے وہ کوئی تین مہینوں میں تیار کر سکے تو جانوں۔ مجھ غریب کی یہی دولت تھی جی۔ سب اپلے بھیگ گئے ہوں گے اور میں ایک ہفتہ فاقے کاٹوں گی۔ اب ایک ہفتہ تک ___"

وہ آگے نہ بول سکی۔ اس کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔ میں اندھوں کی طرح ادھر ادھر ہاتھ ہلاتا آگے بڑھا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوا۔ اس نے کوئی جنبش نہ کی میں نے اس کا ہاتھ بالکل شہری نوجوانوں کی طرح دبایا اور بولا۔ "میں کھنڈر کی چھت تلے تمہارے سب اپلوں کا ڈھیر لگا آیا ہوں۔ بے فکر رہو۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ کانپ گئی ہے۔ "آپ کتنے اچھے ہیں جی"

"میں بہت برا ہوں خانی۔" میں مدت کی ان کہی بات کہنا چاہتا تھا۔ میں نے تمہیں گرا دیا۔ اب جانے تمہیں کہاں کہاں چوٹیں آئی ہوں گی۔"

"میرے کوئی چوٹ نہیں آئی ___ آپ ___"

وہ رک گئی۔ بارش تھم چکی تھی۔ رات پہاڑی نالوں کی آواز سے گونج رہی تھی۔ اور بجلی کی چمک افق کی طرف سرک گئی تھی خانی نے

مجھ سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ "اب میں گھر جاؤں جی؟"

گھر؟ میں نے پوچھا۔ "تمہارا ابھی کوئی گھر ہے خانی؟"

بولی۔ "جی ایک خلاترس نے ایک کٹیا دے رکھی ہے۔ اب جاکر وہاں سے وہ پانی نکالوں گی جو چھت سے ٹپکا ہوگا۔ پھر سر چھپانے کا سہارا تو ہے جی۔"

میرا آراستہ پیراستہ کمرہ اچانک میرے ذہن پر ابھرا۔ لرزا۔ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اندھیروں میں جذب ہو گیا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ میں نے سوچا ہم زندگی کے اس قدر مختلف زاویوں پر رکھے گئے ہیں ــــ یہ کیسا قانون ہے ــــ یہ کیسی مصلحت ہے!

میں نے کہا۔ "خانی۔ آخر تم مجھے یہ کیوں نہیں بتاتیں کہ تم کہاں کی رہنے والی ہو؟ یہاں کیسے آئیں؟ تم گوبر چننے کے لائق نہیں تھیں خانی ــــ تم تو ریشم و کمخواب میں لپٹی رہنے کے قابل ہو!۔"

"آپ ــــ" اس کی آواز کانپ گئی۔ "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ــــ آپ سن کر کیا کریں گے؟"

"خانی!" میں نے احساسات کے طوفان میں دب کر سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ "خانی!"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی انگلیاں بھیگی ہوئی تھیں! ــــ مگر بارش کا پانی گرم تو نہیں ہوا کرتا!

میں نے کہا۔ "خانی اب تم غریب نہ رہوگی ــــ میرے ہوتے تمہیں ــــ"

اُس نے میری بات کاٹ لی۔ "آپ جی ـــــ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ میں ایسی کئی باتیں سن چکی ہوں اور اب انھیں بھلا بھی چکی ہوں۔ میرے ماں باپ نے مجھے جس خوبصورت نوجوان سے بیاہا۔ وہ بھی اسی قسم کی باتیں کرتا تھا۔ پھر جب ایک وبا میں میرے ماں باپ اور بھائی مر گئے تو اس نے ایک اور لڑکی سے شادی کر لی۔ اور مجھے گھر سے نکال دیا۔ اب یہ باتیں مجھ پر اثر نہیں کرتیں ـــــ ریشم اور کمخواب پر سونے کی لذت بھی چکھ چکی ہوں اور گھسے پھٹے چیتھڑوں کی بھی! ـــــ اب اُپلے تھوپنے میں ہی مزا ہے۔ اب ریشم وریشم کی ہوس نہیں رہی جی۔ آپ نے میرے اپلے محفوظ کر دیئے۔ اس کے لئے میرے پاس شکریئے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو میں دینے کی جرأت نہیں کر سکتی" ـــــ

وہ رُک گئی اندھیرے میں کسی نے مجھے پکارا۔ میں نے آہستہ سے کہا "خانی۔ تم مجھے ایسا نہ سمجھو۔ میں ان لوگوں میں سے ـــــ" ایک اور آواز آئی میں نے کہا۔ "کوئی مجھے ڈھونڈھ رہا ہے۔ کل ملو گی؟ ـــــ کھنڈر کے پاس؟ ـــــ کل صبح ـــــ یا شام کو؟ ـــــ ملو گی نا؟ ـــــ اور کوئی جواب نہ پا کر میں نے کہا "اچھا" ـــــ میں اس کا ہاتھ تیزی سے اپنے لبوں تک لے گیا۔ اس نے چیخ کر اسے پیچھے کھینچ لیا میں گھبرا گیا اور دوڑتا ہوا پکارنے والے کی طرف بڑھا میں نے زور سے کہا۔ "کون ہے بھائی؟"

آواز آئی۔ "میں ہوں جی —— دینو مستری۔ سارا گھر آپ کی فکر میں پریشان ہے۔ آپ بارش میں کدھر نکل گئے تھے؟ —— بیماری کی حالت میں؟" اور جب وہ میرے قریب آیا تو بولا۔ "یہ چیخا کون تھا ملک جی؟"

میں نے گھبرا کر کہا۔ "میں چیخا تھا۔ ایک کنکر چبھ گیا تھا پاؤں میں۔"

دینو زور سے کھلکھلا کر ہنسا! کھلکھلاہٹ مصنوعی تھی! میرے دل میں جیسے کسی نے چٹکی لی!

"کھنڈر میں پناہ لی ہوگی آپ نے؟" اس نے پوچھا۔ اور میں کانپ اٹھا۔

بڑی مشکل سے بولا۔ "نہیں نہیں۔ یہیں چلتا پھرتا رہا۔ مجھے ایسے سمے سیر کرنے میں بڑا لطف آتا ہے!"

"ٹھیک ہے ملک جی" —— اُس کے انداز گفتگو میں تضحیک تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا گھر آیا۔ اور بڑی مشکل سے گھر والوں کی تسلی کرائی۔

صبح کو اٹھ کر میں نے کھنڈر کی راہ لی۔ وہ وہاں موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر شرما گئی۔ مطلع صاف تھا۔ گہرے نیلے آسمان میں سورج کی آتشی ٹکیا پوری آب و تاب سے چمک رہی تھی۔ گاؤں کی چھتوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ نہائے دھوئے پہاڑ صاف جھیلوں میں اپنے عکس دیکھ رہے تھے۔ اور خانی کھنڈر سے اپلے اٹھا کر باہر دیوار پر چن رہی تھی۔ میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ "خانی میرے خیال میں کل کی رات

خواب تھی ــــ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

اس نے لجا کر سر جھکا لیا۔

میں نے فرسودہ اور اکھڑ انداز میں اظہار محبت کیا۔ "خانی میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

وہ مسکرائی۔ اس کے لبوں کے گوشوں میں گہرا طنز تھا! بولی "خدا آپ کا بھلا کرے!"

مجھے اس کے اس جواب سے تسلی نہ ہوئی اور پھر سوچا کہ آخر میں نے ابھی اظہار محبت کے جدید طریقے استعمال نہیں کیئے۔ دراصل میرا یہ اظہار اتنا تیز اور رواجی نہیں ہونا چاہیئے تھا میں نئے الفاظ کی تلاش کرنے لگا اور گردن کھجاتے ہوئے پلٹ کر گاؤں کی طرف دیکھا۔ دینو مستری کے کوٹھے کی منڈیر پر ایک بوڑھا مرغا گردن تان کر پکارا "ککڑوں کوں!ــــ یعنی تم نے منہ کی کھائی ہے! میرے دل میں جیسے کسی نے چٹکی لی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک چیل کسی بدبخت مرغی کا چیختا ہوا چوزہ پنجوں میں جکڑے سورج پر سے گذرتی ایک پہاڑی کے تاریک درے میں گھس گئی!

میں چپ چاپ اپنے گھر آگیا۔

اس سال کسی خاص مصلحت کی بنا پر میری شادی روک لی گئی۔

دوسرے سال گرما کی رخصتوں میں میں لاہور سے اپنے گاؤں آیا برات دھوم دھام سے دلھن کے گھر روانہ ہوئی۔ میرے شہری دوستوں نے

گا گا کر میرے سہرے پڑھے میرے دیہاتی ہمجولیوں نے تالیاں بجا بجا کر ڈھولک کے ارد گرد ناچ ناچ کر اپنی بے لوث مسرت کا ثبوت دیا۔

صبح ہوئی تو میں شب بیداری کا اثر دور کرنے کے لئے اکیلا کھیتوں میں نکل گیا۔ اچانک مجھے عقب میں کسی کی چاپ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو اپلوں والی کھڑی مسکرا رہی تھی!

"خانی!" میں نے حیران ہو کر کہا۔

بولی۔ "آج کس کی شادی ہے جی؟"

میرے دماغ پر بجلی سی آ گری! خون کی جگہ میری رگوں میں خانی گردش کرنے لگی۔ آسمان میں جیسے ایک شگاف سا پیدا ہو گیا۔ اور میرے سر پر کئی چٹانیں آ گریں۔ میں تیورا سا گیا!

کچھ دیر کے بعد میں نے سر اٹھایا تو دینو مستری اپنے کوٹھے پہ کھڑا کھانس رہا تھا۔ اور اپلوں والی غائب تھی!

میں سر جھکائے واپس ہو پڑا۔ اپنے گھر کے بڑے دروازے کے قریب سے گزرا تو دور سے مجھے خشک اپلوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر نظر آیا۔

میں نے ایک میراثی سے پوچھا۔ "یہ اُپلے کہاں سے آئے؟"

بولا۔ "کوئی رات کو ڈھیر لگا گیا ہے۔"

دعوتِ ولیمہ کے کھانے تیار کرتے وقت یہی اُپلے جلائے گئے!

---

# افیونی

پَو پھٹے وہ میرے مکان کے سامنے گلی سے دردناک سُروں میں ایک گیت گاتا ہوا گزرتا، ڈھیلے ڈھالے قدم، مست مست تانیں، جیسے بہت تھکا ماندہ ہے، اور جیسے ابھی دیوار کے سہارے بیٹھ کر سستانے لگے گا۔ میرے مکان کی کھڑکی گلی میں کھلتی تھی، مجھے ایک سایہ سا گلی میں رینگتا دکھائی دیتا اور گلی کے آخری سرے پر ایک ننھی سی مسجد کی سیڑھیوں کے پاس جا کر گم ہو جاتا، اس پُراسرار شخص کے گلی میں قدم رکھتے ہی سارے محلے پر سحر سا چھا جاتا، اور میری آنکھ بھی ٹھیک اس وقت کھلتی، جب گلی کے موڑ پر اس کی دکھی صدا بلند ہوتی :-

میں بھُل کے لائی

او یار،

میں تاں بھُل کے لائی[1]

اس کے بعد میں ہزار کوشش کرتا، مجھے نیند نہ آتی۔ صبح کی روشنی

---

[1] میں نے بھولے سے محبت کی، اے میرے محبوب، میں نے تجھ سے بھولے سے محبت کی!

پھیل جاتی، اور وہ دوسرے نمازیوں میں مل کر کہیں چلا جاتا۔

کچھ دنوں کے بعد ہمارے محلے میں اس عجیب و غریب شخص کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں، مجھے ایک بار ایسے مجمع میں جانے کا اتفاق ہوا، جس میں اسی شخص کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔

ایک بوڑھا بزرگ جس کا سر کانپ رہا تھا، اور ننھی آنکھوں میں سرمے کی موٹی دھاری ابھری ہوئی تھی، بولا، بھئی، آج کل بندوق، پستول کا زمانہ ہے، ڈاکو اب کھلے بندوں گھروں میں نہیں آ دھمکتے، فقیروں کا بھیس بدل کر آتے ہیں، اور کوئی تر نوالہ انتخاب کر کے اسے نگل کر چل دیتے ہیں، یہ کمبخت مجھے بہت بڑا ڈاکو معلوم ہو رہا ہے۔"

ایک بڑھیا جو مسوڑھوں سے بھنے ہوئے چنے چبا رہی تھی، بولی، مُوا صبح صبح بھانڈوں کی طرح گا کر نیند حرام کر دیتا ہے۔ خدا خدا کر کے پڑوس میں جا تو کمھار کا گدھا مرا، اب دماغ چاٹنے کو یہ نئی بلا آن دھمکی۔"

پرلی طرف سے سیاہ رنگ کا ایک پیر صد سالہ اپنے عصا کو ٹٹولتے ہوئے بولا۔ "میں اس کی کھوپڑی پھوڑ ڈالوں گا۔"

میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ "وہ کوئی بہت دکھیارا شخص ہے جی۔ پانچ وقت اللہ کے حضور سجدے کرتا ہے۔ تمہیں اس نے آج تک کیا تکلیف پہونچائی، کہ اس کا سر پھوڑنے پر تلے بیٹھے ہو، وہ ہم جیسے سینکڑوں بے نمازوں سے اچھا ہے، اس کڑاکے کے جاڑے میں منہ اندھیرے اٹھ کر نماز کے لئے ذرا منہ ہاتھ دھوؤ تو سارا معمہ تم پر کھل جائے

مجھے تو یہ شخص کوئی بہت بڑا بزرگ معلوم ہوتا ہے۔"

"نہیں، نہیں پیغمبر کہو، پیغمبر! بیعت کر لو اس کے ہاتھ پر۔" ایک ادھیڑ عمر کا شخص اپنی ناک میں چھنگلیا ڈالتے ہوئے بولا۔ "پیر جمن شاہ فرما رہے تھے، یہ جاسوس ہے انگریزوں کا، کل کلاں پولیس کو لے آئے گا اور یہیں محلے میں پکڑ دھکڑ شروع ہو جائے گی۔"

ایک شخص مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "سنا ہے تم فرنگیوں کے خلاف نظمیں کہا کرتے ہو، ہشیار رہنا، تمہارا یہ دکھیارا فقیر کہیں خفیہ پولیس کا انسپکٹر بن کر تمہیں دبوچ نہ لے،

میں نے دلی اطمینان سے جواب دیا۔ "اللہ اللہ کرو بابا، چنبلی کی ڈالی میں تھوہر کے کانٹے نہیں ہوتے۔"

بڑھیا بولی۔ "نظمیں بنانے والے پاگل ہوتے ہیں، کل نورا بھانڈ کہہ رہا تھا، کہ میرے لئے دھرتی کا ہر گل بوٹا خدا ہے، موا اپنی آخرت خراب کر رہا ہے، اور مجھے تو یہ فقیر ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ میری پوتی کہتی ہے اس سے کوئی تعویذ لکھوانا چاہیے! پگلی اس کے آنے سے گھنٹہ بھر پہلے کھڑکی سے سر نکالے ٹھٹھرتی رہتی ہے۔ کہتی ہے صبح صبح اللہ کے نیک بندوں کا دیدار کرنا چاہیے، پگلی!"

"نادان۔ بھولی۔" ایک بوڑھا جس کی چندیا میں سورج کا عکس پڑ رہا تھا، بولا۔ "چودہ پندرہ سال کی عمر میں ان لڑکیوں کے دماغ ٹھکانے نہیں رہتے۔"

اس رات مجھے دیر تک نیند نہ آئی، کبھی کبھی آنکھ لگ جاتی لیکن اچانک میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا، جیسے سوتے میں میرا کسی نے گلا گھونٹ دیا ہے، کھڑکی کھول کر باہر جھانکتا۔ کالی رات تنگ گلیوں میں سنسنا رہی ہوتی اور دور کسی گھر سے کسی ننھے بچے کے رونے کی آواز آجاتی!

کتنی بوقلمون دنیا ہے! میں سوچتا رہا! یہ ننھا نیند میں رو رہا ہے۔ اس کی ماں اپنی نیند حرام کئے اسے تھپک رہی ہوگی۔ بڑا ہو کر یہ ننھا نہ جانے کس قسم کا انسان بنے گا، ہو سکتا ہے، بدچلن ہو، بازاری کوٹھوں پر لڑکیوں کو تاکتا پھرے، چور بن جائے، افیونی ہو جائے، ماں کی ممتا اسے اس حالت میں دیکھ کر کتنی بے چین ہوگی، قدرت اگر کوئی ایسی حکمت کرتی کہ بھٹکے ہوئے نوجوانوں کے سامنے ان کے بچپن کے واقعات ایک فلم کی طرح تیرتے رہتے تو یہ ڈگمگاتے ہوئے سفینے شاید سنبھل جاتے!

پو پھٹی، اور گلی کے پرلے موڑ پر امسی پراسرار شخص کے گانے کی آواز آئی:-

میں بُھل کے لائی

او یار

میں تاں بُھل کے لائی!

میں تینوں ایویں سمجھا جیویں حرف قرآناں دا

تیں مینوں ایویں سٹیا جیویں چھلڑ کماداں دا

میں بھل کے لائی

او یار،

میں تاں بھل کے لائی![1]

میں نے کھڑکی کی سلاخوں میں اپنا چہرہ پیوست کر دیا۔ جب وہ میرے سامنے سے گزرا، تو میں نے اُسے بلانا چاہا۔ مگر دھندلائے ہوئے نظارے اور اُس پُراسرار سائے نے مجھ پر ہیبت طاری کر دی۔ جب وہ کچھ آگے نکل گیا، تو میں نے بصد مشکل دبی دبی آواز میں کہا "او بھائی بات سننا ذرا۔"

وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ گیت اچانک رک گیا۔ اور مجھے آواز کی مڑتی ہوئی لکیریں دور خشک فضا میں اوپر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"کیا مجھے کسی نے پکارا ہے؟" اُس نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔

"ہاں بھئی، بات سننا" میں نے لجاجت سے کہا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے قریب آیا۔ اور بولا۔ "کون ہیں آپ؟ مجھ سے کیا کام ہے آپ کو؟"

---

[1] میں نے بھولے سے محبت کی، اے میرے محبوب۔ میں نے تجھ سے بھولے سے محبت کی۔ میں نے تجھے مقدس قرآن کا ایک حرف سمجھا! تو نے مجھے اس طرح پھینکدیا جیسے گنے کا ایک چوسا ہوا چھلکا۔

میں نے بھولے سے محبت کی، اے میرے محبوب۔ میں نے بھولے سے محبت کی!

میں آپ سے جی کھول کر باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "مجھے آپ سے بے حد دلچسپی ہے، اور میں آج رات صرف آپ کے انتظار میں نیند حرام کئے بیٹھا ہوں۔

"لیکن مجھے نماز قضا ہو جانے کا خدشہ ہے۔" اس نے کمبل کا ایک پلو جھٹک کر کندھے پر ڈالا۔ اور مسجد کی طرف چل دیا۔

میں بھَل کے لائی

..........

میں نے تیزی سے کمبل اوڑھا، اور باہر نکل کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ میری پڑوسن بڑھیا کے مکان کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی جو میرے گزرنے پر کھڑاک سے بند کر دی گئی۔ مؤذن مینارے پر چڑھ کر سُریلی اور باوقار آواز میں پکارا۔

اللہ اکبر!

اللہ اکبر!

اللہ اکبر!

اللہ اکبر!!

میں اپنے آپ کو کائنات کا ایک حقیر ذرّہ تصوّر کرنے لگا ساری کائنات پر مجھے ایک عظیم الشان قوت کا تسلّط محسوس ہونے لگا، اور جب میں مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھا، تو مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے میرے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں! بہت مدت کے بعد میں نے نماز ادا کی، میں جان بوجھ کر اس شخص کے ساتھ کھڑا رہا، اور جب وہ دعا سے

فارغ ہو کر جانے لگا، تو میں بھی اس کے عقب میں ہو لیا، وہ چند پتلی گلیوں کا چکر کاٹتا ایک نہایت اندھیری گلی میں پہنچا، جس کے آس پاس مکانوں کی دیواریں امتداد زمانہ نے سیاہ کر ڈالی تھیں، اور جس کے فرش پر محلے بھر کا کوڑا جمع تھا، اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا، سیاہ کمبل میں آنکھ اور ناک کا تھوڑا سا حصہ نمایاں تھا۔ آنکھوں کے ارد گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے اور زرد ناک کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، جیسے کوئی مدت کا بیمار ہو، بولا "آپ شاید میرا تعاقب کر رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔ میں آپ سے مفصل گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے آپ سے بہت سی باتیں پوچھنا ہیں۔"

وہ دو قدم چل کر میرے قریب آگیا، اور میرے کاندھے پر دھیرے سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "مرتے ہوئے بادشاہ اور دم توڑتی ہوئی رقاصہ سے اس کی شان و شوکت اور عالم شباب کے تذکرے سننے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا انجام اور قریب کھسک آئے، مجھے نہ چھیڑیئے، میں آپ ایسے بھائیوں کا راندہ ہوا مایوس سا انسان ہوں، آدم کے کسی فرزند پر مجھے یقین نہیں رہا۔ مجھے خود اپنے آپ پر اعتماد نہیں، آپ نے تکلیف فرمائی ہے، میں لمبی لمبی باتیں کرنے کے قابل نہیں رہا، اور نہ میرے ہاں کوئی بات اتنی وقعت رکھتی ہے، کہ میں اس کے لئے اپنے لب ہلاؤں، زندگی میرے لئے

ایک بازی گاہ ہے، اور اس میں بسنے والے سب کے سب فریبی اور مکّار ہیں، ظاہر کے صاف اور باطن کے غلیظ، اور متعفن، مرد —— مطلب پرست اور عیار! عورتیں —— عصمت فروش اور بد چلن لونڈیاں جن کا مقصد زندگی وحشی مردوں سے چومے چاٹے جانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں آج کل اندھیرے میں بھر رہا ہوں، چمگادڑ سے آپ سورج کا تذکرہ چھیڑتے ہیں —— اللہ اکبر!"

وہ پلٹ کر آگے چل دیا، اور میں اس کی بے نیازی سے مرعوب ہو کر واپس لوٹ آیا، لیکن گھر آکر یہ خلش میرے دل میں شعلہ بن کر بھڑکی اور میرا سارا وجود جذبات کی شدت سے دہکنے لگا!

اسی روز شام کے وقت مجھے بوڑھوں اور بڑھیوں کی اسی مجلس میں جانے کا اتفاق ہوا، آج وہ کسی موضوع پر بے حد گرمجوشی سے گفتگو کر رہے تھے، ہر دھندلی آنکھ میں چمک تھی، اور ہر جھریاں پڑے لب پر مسکراہٹ، میرے جاتے ہی سب باری باری پکار اٹھے۔ "دیکھئے اپنے فقیر سائیں کے کرتوت؟ سنا کچھ؟"

میں مبہوت سا ہو گیا، بے نور سی آنکھوں سے نکلتی ہوئی کمزور مگر تیز نظروں نے مجھے گھیر لیا، "کچھ سنا؟" کرخت قہقہوں اور خشک کھانسی کی بھٹوں کا ایک طوفان اٹھا۔ اور میری حواس پر چھا گیا۔

"آخر کیا —— کیا بات ہوئی؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا کیا اس نے؟"

میری گھبراہٹ دیکھ کر میری پڑوسن بڑھیا کو ہنسی چھوٹ گئی، اور یک بیک اس ہنسی نے چھینکوں کی صورت اختیار کر لی، لال پڑ گئی، دہری ہو گئی، اور آخر کار میری طرف ہاتھ پھیلا کر چھینک روکتے ہوئے بولی "فقیر سائیں کے چیلے، کچھ سنا؟"

ایک بوڑھا بولا "آج شام تمہارے بزرگ، شہر کے ایک اجاڑ حصے میں دس بارہ آدمیوں کے ساتھ چنڈو نوشی کرتے پکڑے گئے، تمہارے فقیر سائیں میلے چیکٹ تکیے پر سر رکھے فرش پر لیٹے ہوئے تھے! اور افیون کے عرق کے کش لگا کر تقریباً بے ہوش ہو رہے تھے، کہ پولیس نے جا لیا، اب حوالات میں بیٹھے اونگھ رہے ہیں، نماز وغیرہ کا نشہ ہرن ہو گیا ہے، کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔"

میں نے جیسے چاند کو غلیظ جوہڑ کے متعفن کیچڑ میں پھنسے دیکھ لیا ہو سکتے کی حالت میں گھر لوٹ آیا، اور کمرے میں آکر بہت دیر تک گھٹنوں میں سر دبائے کچھ سوچتا رہا، فقیر سائیں کی پر اسرار شخصیت میرے سامنے عجیب و غریب رنگ اختیار کر کے گھومنے لگی، کبھی ایک پاکیزہ نمازی بن کر نکلتا اور "میں بھل کے لائی" کی تقدس آمیز آواز بلند ہوتی ——، کبھی ایک اندھیرا کمرہ ذہن میں ابھرتا، ایک ٹمٹماتا ہوا دیا، کمرے میں افیون کے دھوئیں کی بدبو۔ کالی دیواریں، کالی چھت اور زمین پر بیٹھے ہوئے پانچ دس کمزور، زرد چہروں والے آدمی جن کی جلد کے نیچے انکی بوڑھی ہڈیاں جھلک رہی تھیں —— چنڈو کے دو چار کشوں کے منتظر۔

اور وہ فقیر سائیں کا دو چار کش لگا کر بے جان ہو کر ایک طرف کو لڑھک جانا ——— اور پھر وہ مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا سایہ! ——— میرا سر چکرانے لگا!

علی الصباح جاگ کر خدا کے حضور میں سجدے کرنے والا اور رات کو ایسے مردود نشے میں کھو جانے والا یہ انسان میرے ذہن پر ایک خوفناک تصویر بن کر منڈلانے لگا، دوسرے روز میں فقیر سائیں کو امداد بہم پہنچانے کے طریقے سوچ رہا تھا کہ اچانک میری بیٹھک کی کھڑکی کے سامنے ایک یکہ آ کر رکا، ایک برقعہ پوش خاتون اور ایک ادھیڑ عمر کا بھلا مانس، اترے، بزرگ کھڑکی کے قریب آ گیا، اور میری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہے، اور کہہ نہیں سکتا؛

میں نے آگے بڑھ کر پوچھا "فرمائیے، فرمائیے"۔

بزرگ بولا "یہاں سے ہر صبح ایک نوجوان گزرا کرتا تھا۔ کل رات چنڈو نوشوں کی محفل میں بیٹھا گرفتار ہو گیا ——— سنا ہے آپ کی اس سے دلچسپی ہے، اور پولیس افسروں کے ساتھ آپ کے اچھے گہرے تعلقات ہیں، اگر خدا کے نام پر آپ ........"

میں نے بات کاٹ کر کہا "میں اسی کے لئے ایک پولیس افسر کے پاس جانے کے لئے تیار بیٹھا ہوں، میں اپنی بساط سے بڑھ کر اسے امداد دوں گا، اور میں نے سنا ہے، آج عدالت میں اس کی پیشی بھی ہے۔"

میں انھیں اندر لے آیا، خاتون ایک کونے میں کھاٹ پر سمٹ کر بیٹھ گئی، اور بزرگ میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ہم آپ کے بیحد ممنون ہیں۔"

"لیکن آپ کو اس سے کیا دلچسپی ہے؟"

بزرگ کی آنکھیں پتھرا گئیں، بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ ہمارا بیٹا ہے، ہمارے اور اس کے درمیان اَن بن کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ایسی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا، جس کا خیال آنے سے مجھے وحشت سی ہونے لگتی ہے، ہم نے اس کے لئے ایک سگھڑ اور سلیقہ شعار لڑکی تلاش کی۔ اس سے شادی کر لیتا تو آج رئیسوں میں شمار ہوتا۔ بدقسمت برابر انکار کرتا رہا، ہم بھی یہ برداشت نہ کر سکتے تھے، کہ اسے اپنی چہیتی کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دے کر عمر بھر کے لئے اپنی پیشانی پر کلنگ کا ٹیکہ لگا لیں، ہم نے سختی اختیار کی، تو وہ ایک شب گھر سے نکل بھاگا، اکلوتا بیٹا ہے، بستے گھر کو اجاڑ دیکھ کر ہم گھبرا گئے، اس کی ماں بیچاری پردہ دار بڑھیا بھی ممتا سے مجبور ہو کر میرے ہمراہ گھسٹتی پھرتی ہے، آج یہاں اس کی خبر ملی، مگر افسوس کہ وہ حوالات میں ہے، اور شاید کل عدالت میں......"

بڑھیا رو دی۔ میرا جی بھی بھر آیا۔ میں نے پوچھا۔ "لیکن وہ لڑکی کون ہے۔ کسی بہت نیچی ذات......"

بوڑھا کڑک کر بولا۔ "عزیز یہ ہمارا پرائیویٹ معاملہ ہے!"

مجھے اپنے سوال کا جواب تقریباً مل گیا تھا۔

میں انھیں عدالت میں لے آیا۔ پولیس افسروں سے ملا مجھے ہر طرح سے تسلی دی گئی، کہ اگر وہ اپنے جرم کا اقبال نہ کرے۔ تو اسے صرف پندرہ بیس روپیہ جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ ورنہ نو دس مہینے جیل میں پڑا سڑتا رہے گا۔

ہم تینوں کو پولیس والے حوالات کے قریب لے گئے، وہ کوٹھڑی کے پرلے سرے پر دیوار کا سہارا لئے زمین پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اٹھا اور حوالات کے دروازے تک آگیا۔ اپنے باپ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر کسی قسم کا تغیر رونما نہ ہوا۔ صرف اتنا کہا۔ "آپ کدھر آنکلے ابّا ——— مفت میں تکلیف فرمائی، اور امّی تم کہاں؟"

دونوں دکھیا روحیں بلک بلک کر رونے لگیں۔ آس پاس کھڑے ہوئے پولیس کے سپاہی بھی مغموم سے ہو گئے، اوپر آسمان پر کوئی بھولی بھٹکی بدلی دو چار بوندیں حوالات پر برساتی آگے نکل گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ "اگر آپ اپنے جرم کا اقبال نہ کریں تو چھٹکارا ہو سکتا ہے ورنہ ———"

وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ "مجھے چھٹکارے کی ضرورت نہیں مجھے جہاں پھینکدیا جائے گا، پڑا رہوں گا۔ مجھے آزادی اور اسیری کے فوائد بتانے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔"

سُبکی کے احساس سے میری گردن جھک گئی۔ اور میں پیچھے

ہٹ آیا۔ اس کے پشیمان باپ اور دکھیا ماں نے اسے بہت کچھ سمجھایا، مگر وہ ہر سوال کا یہی جواب دیتا رہا۔ "آپ ناحق کیوں سر کھپا رہے ہیں۔ آپ مجھ سے کوئی امید نہ رکھئے۔"

کچھ دیر کے بعد سپاہی اسے عدالت کی طرف لے گئے، اُسے دیکھنے کے لئے بہت لوگ جمع ہو رہے تھے، وہ سر جھکائے ثابت قدمی سے سپاہیوں کے آگے چلتا گیا۔ اُس کے باپ کے چہرہ پر بھوتوں کی سی بے رونقی چھا رہی تھی، اور اس کی ماں کا پاؤں بر قعے میں بار بار الجھ جاتا تھا۔

کمرۂ عدالت کھچا کھچ بھر گیا۔ لوگ منہ کھولے اس کا بیان سننے لگے۔

"جناب میں ایک مایوس انسان ہوں، نہ کسی کا ممنون ہوں، نہ شاکی، احساس کی گراں بہا دولت میرے سینہ میں مسل ڈالی گئی ہے، اچھے برے کی تمیز سے میں کچھ دور ہو گیا ہوں، میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں واقعتاً اس غلیظ نشے سے اپنی روح کو تسکین پہنچاتا ہوا پکڑا گیا۔ لیکن اگر مجھے اجازت ہو تو میں یہ بھی بیان کر دوں کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔"

جج صاحب اس کی جچی تلی باتوں کو بے حد غور سے سن رہے تھے، قلم کو قلمدان میں رکھتے ہوئے بولے۔ "ہاں، کہو۔"

دراصل جناب عالی۔ اس میں نہ میرا قصور ہے۔ نہ کسی اور کا۔

تقدیر کی بات کہ ایک نیچ ذات کی لڑکی نے مجھ سے ابدی رفاقت کا وعدہ لے لیا۔ میں اعتراف کرتا ہوں حضور، کہ میں یہ وعدہ کرنے پر مجبور تھا۔ کیونکہ اس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔ اور چال ڈھال بہت شاہانہ۔ آپ سمجھتے ہوں گے، کہ یہ ایک معمولی سی بات ہے، جوانی کی ہزارہا لغزشوں میں سے ایک عام قسم کی لغزش ہے، دم بھر کے لئے نفسانی خواہشات کی تسکین کے لئے ایک مرد ایک عورت کے پاس رہتا ہے، جب اس کی سفلی جذبات کی تشنگی بجھ جائے، تو وہ اس سے پرے ہٹ آتا ہے۔ شاید یہ صحیح ہو۔ لیکن میری روح کے عمق میں اس نیچ ذات کی لڑکی کا پیکر ایک مشعل بن کر سما گیا، اور میں نے محسوس کیا، کہ مجھے اس سے اس قسم کا وعدہ کر لینا چاہیئے!

لیکن بھلا ہو میرے والدین کا، انھیں، میرے مستقبل کی فکر تھی، وہ چاہتے تھے، میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کروں، گدگدے صوفوں پر بیٹھوں، مرغن کھانے کھاؤں، ہلکی پھلکی بے آواز کاروں پر اڑتا پھروں، مفلسوں کے پیسے سے اپنی کھیتی کو شاداب کروں۔

انھوں نے ایک اور لڑکی انتخاب کی، کہتے ہیں وہ خوبصورت ہے ہر روز صبح اٹھ کر سنگار میز کے سامنے ایک گھنٹہ صرف کرتی ہے۔ ناخن پالش کرتی ہے، اور لپ اسٹک ہر وقت اس کے سینے والی جیب میں محفوظ رہتی ہے۔ اس کے زریں بالوں میں لونڈر کی خوشبو ہے، اور اس کی زبان پر انگریزی ناچ کے سُر ——— معلوم ہوتا ہے،

ہالی وڈ کی کسی حسینہ نے ساڑھی باندھ لی ہے۔ آپ منصف ہیں۔ آپکو میرے ایسے کئی وارفتہ مزاجوں سے سابقہ پڑا ہوگا۔ میں نے یہ نعمت قبول نہ کی۔ والدین خفا ہو گئے۔ مجھے جوش غضب میں گھر سے باہر نکال بیٹھے، اور اس نیچ ذات کی لڑکی کو اس کے والدین کے مشورے سے جانے کہاں چھپا دیا۔ محروم ہو کر میں ادھر نکل آیا۔ اپنے پیدا کرنے والے کا نام جپتا ہوں، اس کے حضور میں ماتھا رگڑتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے میں ایک بے فکر کبوتر ہوں، اور فضا میں اڑتے اڑتے جب میں زمین پر اترتا ہوں، تو درختوں کے پھول مجھ پر نچھاور ہونے لگتے ہیں۔ میرے قلب کو بہت تسکین پہنچتی ہے لیکن ان سرد راتوں کی اداس تنہائی میں جب مجھے خیالات کے بھوت ستاتے ہیں، تو میں ادھر آ نکلتا ہوں، اور اپنی زخمی روح کو افیون کے نشہ تلے دبانا چاہتا ہوں اب مجھے اس نعمت سے محروم کرنے کیلئے آپ کا قانون آدھمکا۔ مجھے کسی قسم کا عذر نہیں۔ اگر میرے نزدیک زندگی کی کچھ بھی حقیقت ہوتی تو شاید میں جان بچانے کے لئے جھوٹ کا سہارا لیتا۔ لیکن نہیں مجھے اپنے جُرم کا اعتراف ہے۔"

اُس کے والدین وہیں دیوار سے لگے بیٹھے تھے۔ خاموش اور بے جان، صدیوں کے پرانے بتوں کی طرح! منصف کے لبوں میں حرکت آئی۔ بزرگ کی بھویں تک کانپنے لگیں۔

سُفید برقعہ لرزتا ہوا معلوم ہوا۔ میرا دل بھی سیماب وار بیقرار تھا۔

مُلزموں کو اپنے جُرم کا اقرار ہے، اس لئے قانون ان کے لئے قید کی سزا تجویز کرتا ہے۔ ہر ایک ملزم کو......"

میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ میرے تیز متوحش قدم اپنے گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ میں اپنے بستر میں گھس کر اپنے ملتہب دماغ کو سکون پہنچانا چاہتا تھا۔ میں اپنے گھر کے قریب پہنچا تو میری پڑوسن بڑھیا کے گھر کی ایک کھڑکی کھلی، اس کی بھولی بھالی شکل والی نوخیز پوتی ہراساں نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولی "فقیر سائیں کا کیا بنا بھیّا؟"

"وہ قید ہو گئے ہیں۔"

—— کچھ دیر کے بعد میں نے اپنی بیٹھک کی کھڑکی میں سے دیکھا کہ میری پڑوسن بڑھیا محلے کے حکیم جی کو نہایت تیزی سے اپنے گھر کی طرف بھگائے لئے جا رہی ہے!

مسجد کے مؤذن کی آواز آئی:—

اللہ اکبر!

اللہ اکبر!

اللہ اکبر!

اللہ اکبر ——!

# ایک رات چوپال پر

بھدّے سے چولھے کے ارد گرد الجھی ہوئی سفید داڑھیوں والے بوڑھے۔ اکڑی ہوئی مونچھوں والے بانکے گبرو اور گرد آلو دبالوں والے ننھے بچے بیٹھے تھے اور گاؤں کا ذیلدار دو تین کسانوں کی چادروں کا تکیہ بنائے لیٹا تھا۔ فتو میراثی اور نورا دھوبی اس کے پاؤں دبا رہے تھے۔ دیواروں پر پھیلے ہوئے اُن کے دھندلے سائے شعلوں کے اشاروں پر دھیرے دھیرے ناچ رہے تھے۔ تڑک تڑک کی آواز سی لکڑیاں جل رہی تھیں اور چنگاریاں دھوئیں میں لپٹی ہوئی سیاہ چھت کی طرف اڑی جاتی تھیں۔ ایک طرف سے بوڑھے میراثی شیرو نے حقے کا دور شروع کیا۔ گڑگڑ گڑگڑ کی آواز میں ذیلدار نے کروٹ بدلی اور کہا۔ "کیا کہا تھا میں نے؟"

ایک نوجوان آگے جھک کر بولا۔ "آپ ہوٹل والے سے الجھ پڑے اور اس کے جبڑوں میں ایک جلی ہوئی لکڑی گھسیڑ دی۔"

ذیلدار نے ہاتھی دانت کی ننھی سی کنگھی کو کنپٹی کے بھوسلے بالوں میں اٹکاتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں۔ بس تو لوگ اکٹھے ہو گئے۔ بیچ بچاؤ

ہو گیا اور معاملہ ختم ہوا۔ میں وہاں سے وکیل کے مکان پر گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میز پر ایک صندوقچہ رکھا ہے اور وکیل کے سب بال بچے نوکر چاکر اس میں سے گانا سن رہے ہیں!

"میں نے پوچھا۔" وکیل جی۔ ریکارڈ کہاں چھپا رکھا ہے اور سوئی کہاں لگاتے ہیں آپ؟" بولے۔" یہ ریڈ وہے ریڈو۔"

میں نے کہا۔" یہ کیا بلا ہے؟"

کہنے لگے۔" ہم اب یہاں سرگودھا میں بیٹھے بمبئی کا گانا سن رہے ہیں!"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے بھی ساری عمر سفر میں گزاری ہے۔ ایک تو مقدموں کا سلسلہ ہی ختم نہ ہوا۔ دوسری ذیلداری کا معاملہ ہے۔ کبھی گواہی پر جا رہا ہوں تو کبھی صاحب بہادر کو سلام کرنی کبھی کوئی اور بیشی بھگتنے۔ سو کام ہوتے ہیں۔ ہم لوگوں کو۔ لاہور میں بھی ایک بار گیا تھا۔ لیکن میں نے ایسی مشین کہیں نہیں دیکھی کہ سرگودھا میں بیٹھے کلکتے اور بمبئی کا گانا سنتے رہو۔ اصل میں ان وکیلوں کو جھوٹ بولنے کے سوا چین ہی نہیں آتا۔ میں نے ہنس کر کہا۔" کیوں جی؟ آپ مجھے بیوقوف بنا رہے ہیں کیا؟"

"تمام لڑکے بالے ہنس دیئے اور وکیل بھی ہنستے ہنستے کرسی پر جھک گیا۔ میں سمجھا مذاق کر رہے ہیں۔ ان شہریوں کے مذاق بھی عجیب قسم کے ہوتے ہیں۔ ذرا ذرا سی باتوں پر اتنے اتنے بلند قہقہے لگاتے ہیں،

جیسے کوئی معجزہ غضب ڈھا گیا۔ ایک دن میں غلطی سے سرگودھا کے اڈے پر ایک شخص سے پوچھ بیٹھا "کیوں بھئی۔ یہاں سے سرگودھا کا کرایہ کیا ہے؟"

"وہ پہلے تو ہکا بکا مجھے گھورتا رہا۔ مگر اچانک اس زور سے ہنسا کہ میرے ہاتھوں سے پھلوں کی ٹوکری گرتے گرتے بچی تمام ڈرائیور اکٹھے ہو گئے۔ کہنے لگے "اجی ملک صاحب آپ سرگودھا میں کھڑے سرگودھا ہی کا کرایہ پوچھتے ہیں"۔

"آخر اس میں ہنسی کی کونسی بات تھی۔ چام کی زبان ہے، بہک جائے تو کسی کا کیا بس۔ کیوں چچا اللہ یار؟

سب بوڑھوں نے ذیلدار کے بیان کی تصدیق کی۔ ذیلدار کہنی کے بل ہو کر بولا۔ "ہاں تو وکیل صاحب بولے کہ "یہ نیا آلہ ہے اور اس کے تار وار کچھ نہیں۔ بس بمبئی میں ایک شخص گا رہا ہے اور ہم اس کا گانا سن رہے ہیں"۔

"میں تو قرآن مجید کی قسم یہ جھوٹ سُن کر بہت پریشان ہوا۔ ہزاروں میل دور ایک شخص گا رہا ہے، تار وار ہے نہیں۔ اور وکیل میاں مزے سے اس کا گانا سن رہے ہیں۔ تو گویا خدا ان کے قابو میں آگیا۔ گویا اب لوگوں نے جنوں بھوتوں پر بھی قبضہ جما لیا۔ اب یہ جن بھوت کا کام نہیں تو اور کیا کہ اچانک وکیل نے لندن پر سوئی گھمائی اور کوئی عورت لمبے لمبے بین کر کے رونے لگی۔ وکیل کہتا تھا یہ

انگریزی گانا ہے، مگر اللہ نے مجھے بھی کان دے رکھے ہیں۔ گانے اور رونے کا فرق خوب سمجھتا ہوں۔ اس نئی بات پر حیران تھا کہ وکیل نے مصر پر سوئی گھما دی، عربی گانے ہونے لگے۔ لاہور پر گھما دی۔ آواز آئی۔ یہ لاہور ہے! میں تو ہڑبڑا کر کرسی پر جا گرا اور وکیل کے بچوں اور نوکروں چاکروں کو دیکھا تو وہ فرش پر مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ میں غصّے میں وہاں سے اٹھ کر سرائے میں آ گیا اور دوسرے دن گواہی دے کر گھر چلا آیا۔ میرے دماغ میں یہ بات نہیں سماتی اور اگر یہ بات سچ ہے تو کوئی دن قیامت آئی جانو۔"

بوڑھا، اللہ یار ہاتھ سینک کر چہرے پر ملتے ہوئے بولا۔"ملک جی غضب ڈھا رہے ہیں یہ لوگ۔ اڑتی چڑیا کے پر جیسے انھوں نے گنے ہیں شاید ہی کوئی اور گنے۔ زمانہ کا حلیہ بگاڑ دیا ہے انھوں نے! اب اگر ہمارے باپ دادا خُدا کی قدرت سے زندہ ہو کر یہاں آئیں تو دہل کر پھر مر جائیں۔ ریل دیکھو۔ کالی کلوٹی لوہے کی مشین پشور سے لہور اور لہور سے دلّی تک بھاگتی جاتی ہے اور نہیں تھکتی۔ یہ گرامفون باجا دیکھا آپ نے؟ کون بولتا ہے ان کالے توؤں میں؟ بس چابی گھماؤ سوئی اوپر رکھ دو اور" دلدار کمنداں والے دا" "ڈاچی والیا موڑیں مہار وے" "بالو" "چھٹی" جو گانا چاہو سن لو یقین نہیں آتا تھا۔ پر آنکھوں سے دیکھا۔ کانوں سے سُنا" ہاتھوں سے چھوا بھی۔ جادو وادو تو ہے نہیں۔ بس کسی پیچ کی تقصیر ہے کہ آواز کو قید کر رکھا ہے۔ مجید خاں تھانیدار کے بیٹے وحید سے کل

میں نے سُنا کہ بڑے شہروں میں رات کو تماشے ہوتے ہیں۔ سفید چادروں پر تصویریں چلتی پھرتی ہیں۔ گھوڑے دوڑتے ہیں۔ گاڑیاں بھاگتی ہیں۔ ایک سفید چادر پر ساری دنیا لاکر رکھدی۔ مگر مجھے تو اس کا یقین نہیں آتا۔ ملک جی انگریزی پڑھے ہوئے یہ گٹ مٹ کرنیوالے لڑکے جھوٹ بہت بولتے ہیں!

ملک صاحب انگڑائی لے کر اٹھے اور حقے کو قریب لانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے "چچا اللہ یار قسم قرآن مجید کی۔ میں نے ان آنکھوں سے یہ تماشا دیکھا۔ چلنا پھرنا تو ایک طرف رہا۔ یہ تصویریں تو بولتی بھی ہیں ان کے ہنسنے رونے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آتی ہیں۔ پانی گرنے کی کاغذ پھاڑنے کی۔ دروازہ کھلنے کی ـــــ خُدا کی قسم سب آوازیں!"

ایک اور بوڑھا بولا۔ "اب آپ کی زبان سے یہ سن رہے ہیں۔ کوئی اور کہتا تو ہم اسے پاگل سمجھتے۔"

ذیلدار ذرا جھینپ گیا۔ بولا۔ "ارے بابا۔ میں نے دو چار بار یہ تماشا دیکھا۔ اب وحید یہاں ہوتا تو گواہی دیتا۔ اس کے ساتھ میں نے ایک تماشا دیکھا۔ ایک نوجوان کو سات آدمی تلواروں سے مار رہے تھے۔ میں بھول گیا کہ یہ تو صرف تماشا ہے، بس چیخ اٹھا۔ "ارے غضب خُدا کا۔ کوئی بھی اس غریب پر ترس نہیں کھاتا۔ ارے خُدا کے بندو ایک بے کس بے گناہ پیٹا جا رہا ہے۔ اور تم بیٹھے دانت نکال رہے ہو!" بھلا ہو وحید کا جس نے بازو سے پکڑ کر مجھے بٹھایا اور بتایا کہ یہ تو

صرف تصویریں لڑ رہی ہیں۔ تب جا کر مجھے اپنی غلطی کی خبر ہوئی۔ اتنا دھوکا کھا جاتا ہے انسان!"

"سُبحان اللہ سُبحان اللہ! غضب کر دیا۔ کمال کر دکھایا!" کی آوازوں سے چوپال کے دھواں دھار کمرے میں ایک دبی دبی سرسراہٹ کی آواز آنے لگی۔

ذیلدار نے چادروں کو گول کر کے کہنی کے نیچے دھرتے ہوئے کہا۔ "مگر اس ریڈیو والی بات کو میں مر بھی جاؤں تو بھی نہ مانوں جھوٹ کو سچ کیسے کہوں؟"

کمرے کے کواڑ اچانک چیختے ہوئے کھلے۔ ایک نوجوان سنہری عینک لگائے انگریزی بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا اندر آیا اور ایک طرف بوٹ اتارتے ہوئے بولا۔ "السلام علیکم" سب نے جواب دیا "وعلیکم السلام"

ملک جی بولے۔ "آؤ وحید خاں۔ اچھے ہو؟ تمہاری ہی باتیں ہو رہی ہیں۔ اللہ یار تم سے بدگمان ہے، کہتا ہے تصویروں والے تماشے کی بات جھوٹ ہے، وحید جھوٹ بولتا ہے۔"

وحید مسکرایا اور اللہ یار کی طرف دیکھ کر بولا۔ "اچھا بابا جھوٹ ہی سہی۔ تم نہ مانو۔ بزرگوں کو مجبور کون کرے۔ لیکن میں ان کمبخت آنکھوں کو کیا کروں۔ جنھوں نے خود چلتی پھرتی اور بولتی چالتی تصویریں دیکھی ہیں۔ تمھیں دلیلیں دے کر سمجھاؤں تو بھی تم اسی طرح کورے کے کورے رہتے ہو۔ کل ہی یہاں الاؤ پر زمین کے متعلق بات چھڑ گئی تھی۔

میں نے کہا زمین گول ہے۔ تو چچا اللہ یار برس پڑا۔"

چچا اللہ یار نے ایک لکڑی سے انگاروں کو اکٹھا کرتے ہوئے کہا۔ "وحید خاں۔ بات سن میری قسم قرآن مجید کی۔ کل تو میں تیری اس بات کو مذاق سمجھا تھا۔ آج پھر اسے چھیڑ دیا تو بتا زمین کس طرح گول ہے؟"

وحید سنجیدگی سے بولا۔ "اگر یہاں سے کوئی مشرق کو منہ کر کے چلے اور چلتا ہی جائے تو ایک نہ ایک دن پھر یہیں پہنچ جائے گا۔"

چوپال میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔ ذیلدار نے منہ میں کپڑا ٹھونس کر ہنسی روکنی چاہی۔ بچے ایک دوسرے کو ٹھوکے دے کر فرش پر لوٹنے لگے ہنستے ہنستے چچا اللہ یار کی پگڑی کھل گئی۔ آخر کار اس نے ضعیف آنکھوں سے پانی پونچھا اور وحید خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "قیامت تک جئے تیرا پڑھانے والا۔ کیا دلیل دی! اے میں قربان جاؤں! ارے بھئی میں یہاں سے اٹھ کر تمام گاؤں کا چکر لگا کر پھر چوپال پر آسکتا ہوں۔ لیکن گاؤں تو چپٹا ہے۔ پھر یہ کیسے ہوا؟"

وحید خان ان قہقہوں سے مانوس تھا مسکراتے ہوئے بولا۔ "مگر میرا مطلب ایک ہی طرف کو جانے کا ہے۔"

اللہ یار بولا۔ "میں بھی ایک ہی طرف کو جاؤں گا، لاہور یا امرتسر، تو نہیں جانے کا۔"

وحید نے کچھ جواب دیا۔ مگر اس کی آواز کرخت قہقہوں اور بے ربط تالیوں کی گونج میں کھو کر رہ گئی۔

چچا اللہ یار نے یک لخت اپنا چہرہ سنجیدہ بنا لیا اور کہنے لگا " اچھا تو وحید خاں۔ کوئی اور دلیل؟ لیکن دلیلوں کی ضرورت ہی کیا ہے! اللہ نے ہمیں آنکھیں دے رکھی ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ زمین چپٹی ہے!"

وحید بولا " بابا۔ زمین کے مقابلے میں ہمارا وجود بہت ہی چھوٹا ہے اب اگر چیونٹی بہت بڑی گیند پر بیٹھ جائے تو اسے گیند چپٹی ہی نظر آئے گی!"

چچا اللہ یار کا چہرہ ہنسی روکنے کی کوشش میں لال ہو گیا۔ " کیا تم چیونٹی بن کر کبھی گیند پر بیٹھے ہو؟"

قہقہوں اور تالیوں کا ایک اور طوفان اٹھا اور دیواروں پر ناچتے ہوئے سائے ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔

ذیلدار پکار اٹھا۔ " ارے بابا اللہ یار۔ قسم قرآن مجید کی۔ تو نے تو مجھے ہنسا ہنسا کر بے حال کر دیا۔ پسلیوں میں درد ہو رہا ہے۔ تیرے آگے وحید کی کچھ نہیں چلتی۔ سچ کہا تو نے۔ آخر چیونٹی کیا جانے انسان کی باتیں!"

وحید خاں ذرا چیں بجبیں ہو کر بولا۔ " ملک جی آپ تو سمجھ دار ہیں۔ میں آپ سے ہی بات کروں گا سنئے آپ گیلی مٹی کی ایک مٹھی لے لیں۔ اور اسے خوب گھمائیں۔ جب مٹھی تیزی سے گھومے گی تو وہ ہولے ہولے گول شکل اختیار کرنے لگے گی۔ ہر گھومنے والی چیز گول ہوتی ہے۔"

ذیلدار نے کہا " لیکن ہم تو زمین کا ذکر کر رہے ہیں۔" وحید بولا " زمین بھی گھومتی ہے۔"

ذیلدار نے ہنستے ہوئے کہا " یہ نئی بجلی گری!"

چچا اللہ یار پکار اٹھا۔ "یہی کچھ پڑھا ہے تو نے مدرسے میں! زمین گھومتی ہے! سبحان اللہ! معاف کیجیو وحید خاں۔ مجھے تیرے دماغ میں کچھ خلل معلوم ہونے لگا ہے، زمین پر مکان ہیں۔ پہاڑ ہیں۔ سمندر ہیں۔ اگر گھومتے گھومتے سمندر نیچے آجائیں۔ تو پھر پانی زمین پر کیسے ٹھہر سکے گا؟ پہاڑ کیسے جمے رہ سکیں گے؟ ہم خود کیوں نہیں لڑھک جاتے! اور پھر اتنی عمر بیتی میں نے اپنے آپ کو کبھی الٹا چلتا نہیں دیکھا کہ سر نیچے ہو اور پاؤں اوپر!"

وحید آہستہ سے بولا۔ "زمین کے اندر کشش موجود ہے۔ جو ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے!"

اللہ یار تڑپ اٹھا۔ "زمین نہ ہوئی مقناطیس کا پہاڑ ہو گیا۔ خاک کے ڈھیر میں کیا کشش ہو گی آخر! زمین میں کشش ہے، زمین گول ہے زمین گھومتی ہے۔ یہ تو قیامت کی نشانیاں ہیں۔"

وحید خاں، ایک تو اپنی ہٹ کا پکا تھا۔ دوسرے اس قدر تجربہ کار بھی تو نہ تھا کہ چپ ہو رہتا۔ بولا۔ "اگر زمین نہیں گھومتی تو پھر دن اور رات کیسے پیدا ہوتے ہیں؟"

تمام چوپال "یکزبان ہو کر کہا۔ "سورج گھومتا ہے۔"

وحید بولا۔ "نہیں۔ زمین گھومتی ہے اور سورج ساکن ہے۔"

ایک کونے سے ایک سفید ریش بزرگ کھانستا ہوا اٹھا۔ اور وحید کے قریب بڑی مشکل سے بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "خاموش! ایک ذرا سی بات میرے بچے تو کہتا ہے زمین گھومتی ہے۔ میری عمر نوے سال کے

قریب ہے میں نے تیرے پردادا کو بھی دیکھا تھا۔ چوپال کا دروازہ ان دنوں بھی دکھن کی طرف تھا۔ آج بھی دکھن کی طرف ہے اور ہمیشہ دکھن کی طرف رہے گا۔ زمین گھومتی ہے تو اس کا رُخ ضرور پورب پچھم۔ اتر کی طرف پھر جاتا! سادہ سی بات کہی ہے میں نے۔ اب اس کا جواب دے!"

خاموشی چھا گئی! ایک کونے سے ذیلدار کی گائے کی سانسوں کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ وحید بولا۔ "مگر بابا۔ چوپال تو اپنی جگہ پر کھڑی ہر صرف زمین گھومتی ہے، چوپال تو نہیں گھومتی!"

بوڑھے نے کہا۔ "مگر چوپال زمین پر ہے نا۔ زمین گھومی تو ساتھ ہی یہ بھی گھومی۔ میرے پاؤں گھومے تو ساتھ ہی میرا سر بھی گھوما۔ کیوں؟"

"مگر ـــــــ"

مگر وحید کی آواز کسی نے نہ سنی! اور تمام مجمع سفید ریش بزرگ کی طرف دیکھنے لگا۔ جو وہاں سے اٹھ کر پھر اپنے کونے میں بازو کا تکیہ بنا کر اطمینان سے لیٹ گیا تھا جیسے وہ تمام دنیا کو فتح کر آیا ہو!

ذیلدار نے پگڑی باندھتے ہوئے کہا۔ "بزرگوں کا دم غنیمت ہے ورنہ وحید نے تو ہمیں لاجواب کر دیا تھا!"

وحید عینک صاف کرتے ہوئے بولا۔ "ملک جی۔ واللہ اسی لئے چوپال پر آنے کو جی نہیں چاہتا۔ میری بات کوئی سمجھتا تو ہے نہیں اور پھر گلیوں میں ہر کوئی کہتا ہے۔ چوپال پر آیا کرو۔ چوپال پر آیا کرو۔ آخر کس بات پر آؤں یہاں؟ سادہ سادہ باتیں آپ نہیں سمجھ سکے، آپ کو ریڈیو،

سنیما پر یقین نہیں آتا!"

چچا اللہ یار داڑھی میں انگلیاں پھیر کر بولا۔ "کیسے آئے جب یہ بات دماغ میں نہیں سماتی!"

چوپال کا دروازہ اچانک کھلا۔ آبنوسی رنگ کا ایک نوجوان تیزی سے اندر گھسا اور پکار اٹھا۔ "ملک جی سات سات مبارک، لاکھ لاکھ مبارک!"

ذیلدار نے چونک کر پوچھا۔ "کیوں کیا بات ہے؟"

کالے آدمی نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "اللہ نے آپ کو فرزند بخشا ہے۔"

ہر طرف سے صدائیں بلند ہوئیں۔ "مبارک۔ مبارک۔ مبارک۔"

چچا اللہ یار مسکراتے ہوئے بولا۔ "سبحان اللہ۔ چھ لڑکیوں کے بعد لڑکا کتنی خوشی کی بات ہے!"

ذیلدار نے اٹھ کر کہا۔ "ہاں چچا بس ایک بزرگ کی مہربانی ہے۔ بڑی منتوں کے بعد ان سے تعویذ لایا تھا۔ انھیں کی کرامات ہے!"

تمام مجمع کھڑا ہو گیا اور ذیلدار کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وحید اللہ یار کو ایک طرف لے جا کر بولا۔ "کیا کوئی بزرگ لڑکی کو لڑکا اور لڑکے کو لڑکی بنا سکتا ہے؟ تجھے یقین ہے چچا؟"

اللہ یار بولا۔ "ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔ میں بھی تو ایک جوگی کی دعا سے پیدا ہوا تھا!"

وحید منظر سے منہ لپیٹ کر ایک گلی میں مڑ گیا!

# رنگ و سنگ

بازارِ حسن کی خاک چھان کر پرسوں جب عباس باہر نکلا تو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "میں تھک گیا ہوں —— اس کے ماتھے پر بالوں کی جڑوں کے پاس پسینے کے چند قطرے بجلی کی روشنی پڑنے سے جھلملا اٹھتے تھے اور اس کے چہرے پر تھکن کی زردی بکھری ہوئی تھی!

میں حیران ہو کر بولا۔ "کیوں؟ —— آخر کس لئے؟"

کہنے لگا —— جو لوگ شیطان کی شکل وصورت اور چال ڈھال کے متعلق قیاس آرائیاں کرتے ہیں وہ میرے پاس آئیں میں اُن کی انگلی تھام کر اس تنگ گلی کی ہر کھڑکی کے پاس لے جا کر کہوں گا۔ یہ ہیں وہ حسین جادوگرنیاں جو ہزارہا جوانیوں کا خون کر کے اسی طرح چین اور سکون سے بیٹھی ہیں جیسے پہلے روز انھوں نے یہ کوٹھڑی کرایہ پر لی! اور چار گھنٹے کی مسلسل کنگھی پٹی اور غازے مسی کے بعد اسی کھڑکی سے سر نکالا اور سڑک کو بیقراری سے جنبش دیتے ہوئے وارفتہ مزاج نوجوانوں کو اس طرح دیکھا جیسے یہ کاٹھ کی پتلیاں ہیں جن کی کل ان کی ایک نگاہِ ناز اور ایک ادائے دلنواز کے بس میں ہے۔ ان کی یہ گوری اور گداز باہیں زہریلی ناگنیں ہیں جن پر

سر رکھ کر کئی بدقسمت ایسے سوئے کہ جاگنے پر بھی کہیں کے نہ رہے۔ اُن کی یہ سیاہ زلفیں خوفناک طوفانی راتیں ہیں جن میں پھنس کر اچھے اچھوں کے حواس ٹھکانے نہیں رہتے۔ شیطان اتنے روپ دھارن کر کے اس گلی میں آبیٹھا ہے اور خدا جانے اس دنیا کے کتنے شہروں اور ان شہروں کی کتنی گلیوں میں کس قدر بیشمار صورتوں میں نوع انسانی کے سامنے سراب پھیلاتا پھرتا ہے اور آدم کی بھولی بھالی اور سادہ لوح اولاد نفس کی فریاد سے متاثر ہو کر اس سراب کے پیچھے آنکھیں پھاڑے اس تیزی سے بھاگتی رہی ہے کہ اس ویرانے میں وہ کوسوں دور نکل جاتی ہے اور جب پلٹ کر دیکھتی ہے تو اسے اپنے سفر کا نہ آغاز معلوم ہوتا ہے نہ انجام اور وہیں چلچلاتی دھوپ میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہولے ہولے روح کو رگوں سے گھسیٹ کر باہر تپتی ریت پر ڈال دیتی ہے۔ یہ گلی سیدھی موت کے اندھیرے غار میں جا نکلتی ہے۔ اور یہیں انسان اپنی انسانیت کو ذبح کر کے شیطان کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے اور اپنے وجود کو ہمیشہ کے لئے زمین کی پیٹھ کا ایک ناقابلِ برداشت بوجھ بنا لیتا ہے —— سن رہے ہو میری باتیں یا میں یونہی بکے جا رہا ہوں؟ —— او یہ کہاں دیکھ رہے ہو؟"۔

میں نے آہ کھینچ کر کہا —— "وہ آسمان نہ ٹوٹ پڑے"۔

چھاتی کو زور سے رگڑتے ہوئے بولا۔ "تمہاری حیرت بجا ہے۔

—— لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں ——"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "وہ گناہ کے بعد پچھتاوا انسانی فطرت کا خاصہ ہے

وہ شخص بھی جس نے گناہوں کے نرغے میں آنکھ کھولی اور جس کی زندگی کا ہر لمحہ گناہ کی کہر میں لپٹا ہوا بیتتے ہوئے وقت کے پراسرار دھندلکے میں کھو گیا جب کوئی گناہ کرے گا تو اس کی روح کی خلوتوں میں اچانک ایک کوندا سا لپکے گا اور غائب ہو جائے گا۔ روشنی کی ایک لکیر سی ابھرے گی اور مٹ جائے گی۔ انسانیت کا جوہر عظیم دل کی گہرائیوں میں ایک بار کروٹ لیگا اور پھر گناہ کی چٹانوں تلے دب کر ٹمٹمانے لگے گا۔ سیب کھا کر سیب کو کھٹا بتاتے ہو مجھے تمہارا یہ اصول پسند نہیں، اگر تمہاری آنکھوں میں اس قدر بصیرت تھی تو مجھے پنواڑی کی دوکان پر دو گھنٹے کیوں بٹھائے رکھا۔ یہ وقت اگر ہم کسی باغ کے مخملی قطعے پر لیٹ کر گزار دیتے تو کیا ہرج تھا۔ لیکن تم اس طرف کھنچے چلے آئے دیوانوں کی طرح راحت جان کے کوٹھے میں گھسے چلے گئے اور اب اس کے حسن کی دولت سے پورے دو گھنٹے متمتع ہو کر مجھے "گلستاں بوستاں" کی کہانیاں سنا رہے ہو؟ —— بھئی مجھے دو رنگے اصول پسند نہیں۔"

عباس سپٹا گیا۔ گھبرا کر بولا۔ "مجھ سے لغزش ہوئی مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے میں محسوس کر رہا ہوں کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ میں نے آگ تاپتے تاپتے ہاتھوں کو انگاروں میں گھسیڑ دیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ایسا کرنے سے گوشت گل سڑ جاتا ہے۔ ٹھوکر کھا کر انسان آنکھیں کھولتا ہے بجلی گرے تو خرمن سمیٹنے کی فکر پڑتی ہے۔ گناہ کی بھٹی میں جھلس کر حق کی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ عورت اور

شیطان میں صرف ایک چیز مختلف ہے اور وہ ظاہری شکل وصورت ہی جلد کی نیچے جو دل دھڑک رہا ہے اور رگوں میں جو روح تیر رہی ہے ان میں گناہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے 'میری طرف آؤ ـــــ میری گود میں لیٹو۔ میرے زانوؤں پر سر رکھ کر میری زلفوں کو انگلیوں پر لپیٹو اور چہرے پر پھیلاؤ تاکہ میں تمہارے اس شغل سے فائدہ اٹھا کر تمہارے سینے کے اندر ہاتھ ڈالوں اور تمہارا کلیجہ نکال لوں، اُس خلا میں دنیا جہان کی عفونتیں اور غلاظتیں بھر دوں تاکہ انسانیت کا جوہر عظیم اس اندھیرے میں ابھر نہ سکے ــــ مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ انسانی نسل کو عورت سے بہت قریبی تعلق ہے ورنہ اس صنف کو سیکڑوں من بھاری پاٹوں والی چکیوں میں پیس کر اور دھول بنا کر ہوا میں اڑا دیا جاتا۔ اور تب جا کر دنیا روحانی سکون اور قلبی راحت سے دوچار ہوتی ــــــ"

وہ سگریٹ نکال کر سلگانے کے لئے رکا۔ پاس ہی ایک گلی کے نکڑ پر دو نوجوان کھڑے باتیں کر رہے تھے ایک بولا "ارے چھوڑو اسے کوّا چونے میں نہا لے تو اسے بگلا کون کہے۔ پرسوں آنسوؤں سے میرا رومال بھیگ گیا۔ دیکھا تو وہ بھی رو رہی تھی۔ ہاتھ بڑھا اس کے آنسو پونچھے تو غازے کی تہیں۔ میرے رومال سے چپک گئیں اور نیچے سے اس سڑک کی سی جلد نکل آئی ــــ پرانی سلیٹ کی طرح بے رونق۔ خالص آبنوسی چمک! مجھے حیران دیکھ کر بولی۔ "کیا سوچ رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "سوچ رہا ہوں کہ آسمان پر بادل چھائے رہیں تو کیسا سہانا سماں رہتا ہے۔ بادل پھٹ جائیں

تو جیسے ہر طرف الّو بول رہا ہے۔" جھینپ کر ہنسنے لگی اور اس کی پیلی داڑھیں اور سُرخ تھرتھراتا کوّا دیکھ کر اللہ قسم طبیعت متلا گئی ——— میں تو آج راحت جان کے دروازے پر دھونی رماؤں گا۔

دوسرا بولا۔" کیا کہنے ہیں راحت جان کے پرسوں نواب صاحب کے مکان پر محفل برپا کی گئی۔ پہلے تو سر جھکائے بیٹھی رہی۔ کسی کو وہم تک بھی نہ گزرا کہ راحت جان کی شکل میں جادو مجسم ہو گیا ہے جب اٹھی اور گھگھری کے دونوں کناروں کو ہاتھوں سے اوپر اٹھا کر ٹھُمکتے ہوئے دو چار پھیریاں دیں اور آنکھیں مٹکا کر "ڈھاکے کی ململ کی انگیا سلا دو" کی تان اڑائی تو نواب صاحب کے چغے سے نوٹوں کا گٹھا اچھل کر اس کے گھگھرے میں آ رہا۔ طبلے والے نے طبلے پر تھاپ دی تو جیسے آسمان پھٹ پڑا۔ نواب صاحب چمکارتے ہوئے بولے۔" تیری پنڈلیاں گوشت پوست کی ہیں کہ کہیں سے مرمر کی ٹانگیں خرید لائی ہو ——— انگیا والی بات دُہرانا ذرا ——— منہ مانگی مراد پائے گی ———"

عباس میری انگلیاں دباتے ہوئے بولا۔" کاش میں انھیں سمجھا سکتا"

میں نے کہا۔" تجھکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو ——— !"

بولا۔" میں آخری فیصلہ کر چکا ہوں۔"

---

عباس پچیس سال کا وجیہ نوجوان تھا۔ برسوں سے ہم دونوں اکٹھے رہتے تھے وہ نہر کے دفتر میں کلرک تھا اور میں ایک مجسٹریٹ کا اہلمد میں نے

اس کی فطرت کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ اس کے لبوں سے جو بات نکلتی تھی اس کے قانون بن جاتی تھی کسی کام کا ارادہ کرتا تھا تو دنیا جہان کی رکاوٹوں کو چیرتا پھاڑتا اس کی تکمیل کر کے دم لیتا۔ باوجود اس غضب کا عملی انسان ہونے کے اس کا ایک مشغلہ خیال آرائی بھی تھا اور کبھی کبھی اس کی خیال آرائی ایسی شکل اختیار کر لیتی تھی کہ مجھے اس پر دیوانے کا شبہ ہونے لگتا تھا۔ ایک روز وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا بہت دیر تک کچھ سوچتا رہا اور آخر میری طرف دیکھے بغیر بولا "پتھر گرمی کی شدت سے تپ جاتا ہے! انسان بھی جذبات کی تپش سے دہکنے لگتا ہے! اس لئے انسان پتھر ہوا لیکن یہ کیا بات ہے کہ پتھر انسان نہیں بن سکتا درانحالیکہ انسان پتھر بن سکتے ہیں۔"

میرا دماغ بھنا گیا۔ میں نے کہا "یہ کیا فلسفہ ہے؟ الٹی سیدھی باتیں کہہ کر مجھ پر اپنی کھوکھلی علمیت کا رعب گانٹھتے ہو؟"

سر اٹھا کر بولا "تم پتھر ہو۔"

وہ کہا کرتا تھا کہ تم بھی سوچتے ہو لیکن تمہاری سوچ ایک سیدھی پگڈنڈی پکڑ لیتی ہے اور ادھر ادھر دیکھے بھالے بغیر اپنی منزل کی طرف سرپٹ بھاگتی ہے میں بھی سوچتا ہوں لیکن میری سوچ اپنی راہ کی آس پاس کی ہرتی بھرتی راہوں پر ٹہلتی، گنگناتی اپنی اصلی راہ پر آ کر پھر ننھی ننھی آڑی ترچھی پگڈنڈیوں کے جال میں رینگنے لگتی ہے۔"

پرسوں بھی مجھے اس نے یہی بات کہی "تم نے جو باتیں کتابوں میں

پڑھی ہیں وہی میرے سامنے دہرا رہے ہو۔ تم نے خود محسوس نہیں کیا اور دوسرے کے احساسات اپنے لفظوں میں بیان کر کے مجھے قائل کرنا چاہتے ہو۔ دراصل میں اپنی راہ کے اردگرد کے حالات سے بے خبر نہیں رہتا۔ میں جو کچھ کہتا ہوں سوچ بچار کے بعد کہتا ہوں اور مجھے آج تک اپنے فیصلوں پر پچھتانا نہیں پڑا۔"

میری شادی ہو چکی تھی مگر وہ ابھی تک کنوارا تھا۔ میں نے اسے کئی بار مجبور کیا کہ وہ شادی کر لے۔ اس عمر میں انسان رفیقۂ حیات کے لئے ترستا رہے تو اس وقت اس کی کیا ضرورت جب کھانسی کے جھٹکے دماغ کی سلوٹوں سے خون کے قطرے اور پھیپھڑوں کے قریب گتھیوں سے بلغم کے گولے کھینچ کھانچ کر زندگی اجیرن کر ڈالیں۔ لیکن وہ عموماً یہی کہتا تھا کہ ابّا جان میری شادی کے خلاف ہیں۔ کہتے ہیں کہ کچھ تنخواہ بڑھے تو کوئی لڑکی تمہارے دامن سے باندھ دی جائے۔ اب جبکہ تمہاری تنخواہ مہینے بھر کے لئے خود تمہارے اخراجات کی متحمل نہیں ہو سکتی تو کسی اور کو تمہارے ہاتھوں میں ٹھونسنے کا مطلب یہ ہے کہ فاقے کھینچو اور وقت سے پہلے مر جاؤ۔ خود میں بھی اس قسم کی شادی کے خلاف ہوں۔"

جو شخص اس عمر میں بھی شادی کے خلاف ہو میں اسے اکثر کسی حکیم یا ڈاکٹر سے مشورے کی نصیحت دیا کرتا ہوں۔ ایک روز میں نے عباس سے بھی یہی کہنا چاہا مگر اس روز وہ باغ کی طرف جانے کے بجائے اس بازار کی طرف لوٹ پڑا اور بولا۔" دنیا میں رہنے کا مطلب یہ نہیں کہ کولھو کے بیل

کی طرح ایک جگہ گھومتے رہو ہر شخص کا خوب غور سے مطالعہ کرنا چاہئے اس میں کوئی نہ کوئی دلچسپی کی چیز مل جائے گی۔ اس بازار کی شہرت سنتے سنتے کان پک گئے ہیں لگے ہاتھوں آج ادھر کا بھی چکر کاٹ لیں دیکھیں تو گناہ کا سودا کس طرح کیا جاتا ہے۔"

شادی سے پہلے میں بھی انھیں گلیوں میں بھٹکتا رہا تھا۔ مگر اب اس طرف جانے سے میں قدرے جھجکا میں نے کہا۔ "کوئی دیکھ لے تو کیا کہے؟"

مسکرا کر بولا۔ "کوئی دیکھ لے تو یہی کہے کہ عباس اور انور رنڈیوں کو تاڑتے پھر رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تم تو ہر جگہ سوچ سمجھ سے کام لیتے ہو یہاں کیوں لڑکھڑا گئے؟"

بولا۔ "اپنی عزت اپنے ہاتھوں میں ہے، لوگوں کی زبانوں کی غلام سمجھ لی جائے تو کل کلاں کو اچھے اچھے بزرگوں کی پگڑیاں اچھال دی جائیں۔"

اس طرح سے اس بازار میں جانے کی لت پڑ گئی اور وہ اپنے متین حلقہ احباب میں کافی بدنام ہو گیا۔ میں اسے صرف اس لئے سمجھانے سے ہچکچاتا تھا کہ وہ مجھے لاجواب کرنے میں تاک تھا اور میری کوئی دلیل آج تک اس کے نزدیک قابل قبول نہ ہوئی تھی۔ تین مہینے بلاناغہ اس نے ان کوٹھوں کے چکر کاٹے۔ ٹوٹتی راتوں تک راگ رنگ کی محفلیں برپا رہیں۔ تین مہینے اس کے قدموں کا رخ دفتر سے گھر اور گھر سے اس گلی کی طرف رہا جب وہ اس بازار سے گزرتا تو تنگ کھڑکیوں سے اس کے سر پر پھول برسائے جاتے اور باریک باریک آوازیں آتیں "کدھر کے ارادے ہیں؟ کس کی

کٹیا آباد ہوگی؟ آج کس کا نصیبہ جاگے گا؟"

تین مہینوں کے بعد ایک روز اسے گھر سے ایک خط ملا کہ اس کے لئے ایک جگہ بات کی گئی ہے لیکن لڑکی والوں نے ٹکا سا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہم نے عباس کی بدچلنی کے چرچے سن رکھے ہیں وہ رنڈیوں کی دلدہی سے فارغ ہولے ابھی وہ بیوی بچوں کے الجھیڑوں میں پھنسنے کا نہیں۔"

پرسوں وہ راحت جان کے کوٹھے پر گیا تھا۔ واپس آیا تو مجھے اپنے آخری فیصلہ سے آگاہ کر دیا کہ وہ اس طرف کا رُخ جیتے جی پھر کبھی نہیں کرے گا"

کل وہ سارا دن پریشان رہا دفتر سے واپسی پر گھر آیا تو کھاٹ پر دھم سے گرا اور ساری رات کروٹیں بدل کر صبح کر دی میں نے محسوس کیا کہ اب نشہ اتر رہا ہے اور وہ تھکاوٹ جو اتنے طویل نشہ کا لازمی نتیجہ ہی عباس کو پریشان کئے ہوئے ہے۔

آج اتوار تھا۔ سارا دن ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے اس کی ہر بات میں اضمحلال سا تھا جیسے کمھلائی ہوئی کلیاں بکھیر رہا ہے شام کو میں کسی کام کیلئے اپنے کمرے میں گیا واپسی پر دیکھا کہ عباس برآمدہ کے ستونوں کی آڑ لیتا خشک پتوں سے قدم بچاتا کھٹے کی باڑ کے ساتھ ساتھ سڑک کی طرف کھسکا جا رہا ہے۔

میں کافی فاصلے پر اس کے پیچھے ہولیا اس نے سڑک عبور کر کے پلٹ کر دیکھا اور پھر نہایت اطمینان سے چلنے لگا میں مکانوں اور درختوں کے سائے میں چھپتا ہوا اس کے عقب میں تھا۔ وہ اندھیری پتلی گلیوں میں تیز تیز قدم اٹھاتا راحت جان کے بالاخانے کے نیچے پہنچا۔ سر کھجایا۔ سگریٹ سلگایا اور تنگ سیڑھیوں میں لپک کر غایب ہوگیا۔

پنواڑی کی دکان کھلی تھی۔ میں تین ٹانگوں والی لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیشمار سگریٹ راکھ بنا کر پھینکدئیے۔ بارہ بجے پنواڑی سگرٹوں پانوں اور بیڑیوں کے ڈبے اندر رکھتے ہوئے بولا "بابوجی! ذرا یہ کرسی دے دیجیو، میں جارہا ہوں۔ چھوکرے کی کھبر جاکر لوں، آوارہ مجاج ہوگا ہے۔ لونڈیاں تاکتا ہے کلیجوا میں انگارے دہکے ہیں بیچارے کے جوروا ملے تو چین آئے۔ میّا کوٹال مٹول کر کھسک آتا ہے ادھر چکلے میں ـــــ اس کی کھبر جا کر لوں۔ ذری بائیں ہاتھ سے یہ جوتا تو پکڑادیجیو۔ ماپھ کرنا۔"

میں نے کرسی اٹھا کر اسے دیدی اور جوتا آگے سرکا دیا۔ وہ بولا "بابوجی کا انتجار ہے؟" اور کمبخت نے ہنسی روکتے ہوئے کہا "انتجار میں بھی مجا ہے بابوجی!" اور وہ قفل چڑھا کر چلدیا۔ میں اس کی دکان کے سامنے گیلے اور غلیظ تختے پر بیٹھا بالاخانوں کی کھڑکیوں کے چمکتے ہوئے شیشوں کو دیکھتا اور سوچتا رہا کہ ان رنگین شیشوں کے اس طرف جو عورتیں پاپ کی سوداگری کر رہی ہیں انھیں برا کہوں کہ ان مردوں کو برا کہوں جو......

دھک۔ دھک۔ دھک۔ عباس لکڑی کی سیڑھیاں اتر کر ڈھیلے ڈھالے قدم اٹھاتا باہر سڑک پر آگیا پلٹ کر اوپر دیکھا اور پھر ماتھے پر رومال پھیرتا ایک طرف کو جانے لگا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ گیا اور چونک کر بولا "انور" میں بولا "پچیس سال کے کنواری نوجوان کو چاہیے کہ وہ عورت کو شیطان کا لقب دیتے ہوئے پہلے اپنے دل کو بھی ٹٹول لے۔"

مسکرا کر بولا ـــــ "تم تو پتھر ہو!"

# فساد

لوٹے پھوٹے طاقچے میں ٹین کا ایک میلا سا دیا ٹمٹما رہا تھا اور کمرے کے عین وسط میں ایک چولھا سلگ رہا تھا۔ زرد انگاروں کی چمک ایک بوڑھے اور افسردہ چہرے پر پڑ رہی تھی۔ چہرے کی بے رونقی اور انگاروں کی زردی نے مل کر چہرے کے اردگرد ایک ایسا خوفناک ہالہ بنا دیا تھا۔ جو اکثر مرنے والوں کے چہروں کے اردگرد دیکھا جاتا ہے۔ اچانک دیوار کے پیچھے سے ایک ٹڈی چیخ اٹھی اور کمرے کی مردہ فضا جیسے سانس لینے لگی۔ غیر شعوری طور پر بوڑھے کو بھی اس تبدیلی کا احساس ہوا۔ اس نے ایک لکڑی سے انگاروں کو اکٹھا کیا۔ دیئے کی طرف دیکھا اور گھڑے پر اچٹتی سی نظر ڈال کر پھر گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

ایک بار بڑی مشکل سے اٹھ کر اُس نے دروازہ کھولا اور باہر جھانکا اندھیرا سنسنا رہا تھا۔ سارے شہر میں روشنی کا ایک دھبہ تک نہ تھا۔ اور ہوا بند تھی۔ بوڑھا سوچنے لگا۔ "آخر معاملہ کیا ہے! گھٹا ٹوپ اندھیرا اور موت کی سی خاموشی! یہاں کبھی کبھی محلہ خواجہ آباد کی سڑک پر یکہ کھینچنے

ہوئے کسی ٹٹو کے زخمی سموں کی آواز آجاتی تھی۔ وہ بھی ناپید ہے۔ سڑک کے اس پار بالاخانوں کی کھڑکیاں آدھی آدھی رات تک جگمگاتی رہتی تھیں۔

"آج کیا غضب ہوا کہ سارے شہر کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہے!"

اس نے سر کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔ اور دروازہ بند کر کے پلٹ رہا تھا کہ اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ آواز تیزی سے قریب آتی گئی اور جب دروازے کے بالکل مقابل آگئی تو بوڑھے نے نہایت تیزی سے دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی کسی کے بھاگنے کی آواز آئی اور پاؤں کی چاپ دور ہوتے ہوتے اندھیرے میں ڈوب گئی! بوڑھا دم بخود رہ گیا! بہت دیر تک دروازے کا سہارا لئے خوفناک تاریکی میں کسی نامعلوم نقطے کو گھورتا رہا۔ اور جب ایک ہلکے سے جھونکے سے اندر دیئے کی لو لرزی تو وہ دروازہ بند کرنے کو پیچھے ہٹا۔ ایک طرف سے اسے پھر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ باہر آگیا اور پکارا۔ "تیرا بھلا ہو بھائی۔ ایک بات سنتے جائیو میری۔"

"آنے والا رک گیا اور وہیں سے بولا۔ "کون ہے تو؟"

بوڑھے نے جواب دیا۔ "ایک بدبخت بوڑھا ہوں۔ میرا بیٹا شہر کی اس طرف لکڑی کے کارخانے میں کام کرتا ہے۔ چراغ جلے لوٹ آتا تھا پر آج اتنی رات گئے واپس نہیں آیا!"

وہ شخص بوڑھے کے قریب آگیا۔ بوڑھے کی آنکھیں اب اندھیرے سے

مانوس ہو گئی تھیں۔ اپنے پاس ایک سایہ سا کھڑا پایا تو بولا "تم کون ہو بھائی؟"

نو وارد بولا "میں پولیس کا سپاہی ہوں۔ آج شام کو شہر میں ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے اس لئے بازار بند ہیں اور موٹریں یکے وغیرہ رک گئے ہیں۔ روشنیاں گل کر دی گئی ہیں تمہارا لڑکا صبح کو واپس آجائے گا۔ اس وقت سارے شہر سے گزر کر ادھر آنا تو جان بوجھ کر زندگی سے ہاتھ دھونا ہے۔ تم سو جاؤ۔ وہ صبح تک واپس آجائے گا۔"

بوڑھے نے محزون لہجہ میں کہا "لیکن اس وقت وہ اپنی دن بھر کی کمائی سے میرے لئے چلو بھر دودھ لے آتا تھا۔ آج مجھے بخار بھی ہو رہا ہے۔ اور اس کی فکر میں نیند بھی نہیں آتی۔ وہ آئے گا تو ضرور۔ پر یہ فسادی لوگ غریب امیر چھوٹے بڑے کا شکار کھیلتے ہیں۔ وہ بھی ان کی زد میں نہ آجائے!

"اللہ اللہ کرو بابا" سپاہی بولا "اللہ اللہ کرو سو جاؤ اب"——

اور سپاہی آگے بڑھ گیا۔ دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیئے کی مدھم روشنی میں اس کی رائفل کی نال چمکی۔ بوڑھے کے اندھیرے دل میں امید کی کرن سی جھلملا اٹھی۔

اب وہ بڑے اطمینان سے دروازہ کھلا چھوڑ کر چولھے کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اور زیر لب کچھ بڑبڑانے لگا۔ ٹڈی اسی طرح چیخ رہی تھی۔ چند پتنگے دروازے کے راستے اندر گھس آئے تھے اور دیئے کا چکر کاٹ کاٹ کر طاقچے پر بیٹھ جاتے تھے زرد انگارے آہستہ آہستہ

بجھ رہے تھے اور ان پر سفید راکھ کی نرم نرم تہ سی ابھر رہی تھی!

بوڑھے نے اپنا سر گھٹنے میں چھپا لیا۔ اور بہت دیر تک اپنے بیٹے کے متعلق بے ہنگم خیالات میں محو رہا۔ اچانک اسے اپنے پاس کسی اور شخص کی موجودگی کا احساس ہوا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو پولیس کا وہی سپاہی کھڑا تھا۔ وہ بوڑھے کو پریشان دیکھ کر بولا" بابا کیا ابھی تک تیرا بیٹا نہیں آیا؟ اب تو تیسرا پہر جا رہا ہے!"

بوڑھے نے ایک طرف کھسک کر سپاہی کو چٹائی کا ایک اُدھیڑ سا ٹکڑا پیش کیا۔ لکڑی سے بجھتے ہوئے کوئلے پھیلا دیئے اور بولا" ابھی تک تو نہیں آیا!۔ اور بھائی کیا آج ساری رات پہرہ دیتے رہو گے؟ انگیٹھی بھی بجھ چلی کہو تو آگ جلا دوں؟"

سپاہی بولا" نہیں بابا۔ آگ واگ کی ضرورت نہیں۔ ہم لوگ تو برف کے طوفان میں بھی باہر چلنے پھرنے کے عادی ہو چکے ہیں لیکن تم سو کیوں نہیں رہتے؟ تمہارا لڑکا صبح صبح آنکلے گا۔ اب فساد ختم ہو چکا ہے اور شہر میں سوار پولیس گشت کر رہی ہے۔"

بوڑھے نے کمال اشتیاق سے پوچھا۔" پر فساد ہوا کیسے؟"

سپاہی بولا" جیسے سب فساد ہوتے ہیں۔ شام کو کمیٹی کے ایک نلکے پر دو لڑکے پانی پینے آئے۔ ایک نے کہا" پہلے میں پیوں گا" دوسرا بولا نہیں پہلے میں پیوں گا ورنہ مجھے نلکا دھونا پڑے گا" بچے تو تھے ہی اس تو تو مَیں مَیں کے بعد ہاتھا پائی پر اتر آئے ادھر سے چند غنڈے گزر رہے تھے

انھوں نے دونوں کو الگ الگ کر کے نام پوچھے۔ ایک نے کہا میرا نام لال دین" دوسرا بولا "میرا نام لال چند" پاس ہی ایک دوکاندار یہ باتیں سن رہا تھا بولا۔ "ہائیں! ہندو اور مسلمان" دوسرے دوکاندار نے کہا "ارے یہ کیا ہوا؟ یہ مجمع کیسا ہے؟" ادھر سے جواب ملا۔ "ایک ہندو اور مسلمان میں جھگڑا" تیسرا دوکاندار پکار اٹھا۔ ہندو مسلمان میں جھگڑا؟ چوتھی دوکان سے آواز آئی۔ "کیا؟ ہندو مسلم فساد؟" بس پھر کیا تھا۔ "ہندو مسلم فساد۔ ہندو مسلم فساد۔" کا شور مچ گیا۔ دکانیں کھٹا کھٹ بند ہونے لگیں۔ بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔ چھتوں سے اینٹیں برسنے لگیں۔ دریچوں سے تیزاب کی پچکاریاں چھوٹنے لگیں۔ چاقو چلنے لگے۔ ایک محلہ سے دوسرے محلہ میں اور دوسرے سے تیسرے میں یہ آگ پھیلتی چلی گئی کوئی قتل وتل نہیں ہوا۔ کچھ لوگ زخمی ہوئے ہیں اب پولیس نے حالات پر قابو پا لیا ہے۔ صبح تک بالکل امن ہو جائیگا۔"

بوڑھے نے اپنی گردن کھجاتے ہوئے تعجب سے کہا "ذرا سی بات پر اتنا ہنگامہ مچا"

سپاہی بولا "ہندوستان کے فسادات کی شہرت اسی وجہ ہی سے تو قائم ہے۔ عید پر فساد۔ محرم پر فساد۔ دسہرے پر فساد۔ انسانی لہو یہاں کے تہواروں کا خاص جزو ہے۔ لہو نہ بہے تو تہوار چپ چاپ گزر جائیں اور فسادی یہ بے رونقی کب گوارا کرتے ہیں۔ اصل میں بابا۔ انسانی لاشوں کو تڑپتا دیکھنے کا نشہ بہت تند ہوتا ہے۔"

بوڑھے نے کہا "تم پڑھے لکھے لگتے ہو!"

سپاہی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں پڑھا لکھا ہوں۔ بارہ جماعتیں پڑھیں۔ پھر باپ ایک فساد میں مارا گیا۔ دوستوں اور عزیزوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ بڑی مشکل سے پولیس میں بھرتی ہوا ہوں۔ پیٹ بھرنے کی سبیل مل گئی ورنہ بھکاری بننا پڑتا۔"

بوڑھا بولا۔ "بھکاری یا مزدور"۔

سپاہی نے برانڈی کو اپنے ارد گرد لپیٹ کر کہا۔ "ہاں۔ یا مزدور پھر بھکاری اور مزدور میں آخر فرق ہی کیا ہے ایہی نا کہ بھکاری ہاتھ پھیلاتا ہے اور پیسہ مانگتا ہے۔ مزدور ہاتھ ہلاتا ہے اور پیسہ مانگتا ہے پھر مزدوروں سے بھکاری کئی درجہ خوش نصیب ہیں انھیں صرف خودداری اور عزت سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ مزدوروں کو اپنی صحت اور پھر اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔"

بوڑھے کا پوپلا منہ کھلا ہوا تھا۔ اور وہ نوجوان سپاہی کو بڑے احترام سے دیکھ رہا تھا۔ سپاہی کے چہرے کے خدوخال کانپ رہے تھے۔ اور وہ نہایت بے تابی سے بندوق کی نالی پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

کچھ دیر خاموش رہے اچانک ایک بڑا سا چوہا مکان کے ایک کونے سے نکلا اور سامنے دیوار میں گھس گیا۔ ٹڈی خاموش ہو گئی پروانوں کی تعداد اب بڑھ گئی تھی۔ اور دیئے کی لو ان کے حملوں سے کانپ رہی تھی۔ اچانک دو چار پتنگوں نے مل کر اس پر حملہ بول دیا اور

دیا بجھ گیا! سپاہی بولا۔ "لو بابا اب تم سو جاؤ۔ میں صبح تیرے پاس آؤں گا۔ آج ہمارے پہرے لمبے کر دیئے گئے ہیں میں سات بجے تک اس محلے میں ہوں۔ کہو تو دیا جلاتا جاؤں؟"

بوڑھے نے جواب دیا۔ "بجھا رہنے دو۔ پر بچے اگر کہیں میرا بیٹا ملے تو اسے جلد میرے پاس پہنچا دینا۔ میں گھبرا جاؤں گا اس کی راہ تکتے تکتے!"

سپاہی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ اسی وقت نہیں آسکے گا۔ تم بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ کارخانے کی طرف فسادی جا ہی نہ سکے۔ وہیں پڑ رہا ہو گا۔ صبح آجائے گا۔"

سپاہی نے باہر جاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ بوڑھا اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے لڑکے کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ کئی بار وہ اسے ہاتھ میں دودھ کا پیالہ لئے گلیوں میں بچتا بچاتا گھر کی طرف بھاگتا نظر آیا۔ کئی بار وہ اسے کارخانے کی ایک بلند چمنی سے پیٹھ لگائے اطمینان سے گنگناتا دکھائی دیا اور ایک بار تو وہ زخموں سے چور......!

بوڑھے نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اور زور زور سے کھانسنے لگا۔ تاکہ یہ خوفناک خیال دل سے نکل جائے۔ کوئلے بجھ رہے تھے! اور بجھتے بجھتے ان سے آخری وقت ایسی دودھ کی سی سفید روشنی نکلتی تھی کہ بوڑھے کی اندھیری آنکھیں اور دھڑکتا ہوا دل دونوں روشن

ہو جاتے تھے۔

وہ چلّا اٹھا۔ "میرا بیٹا ضرور واپس آئے گا۔ میرا بیٹا ضرور واپس آئے گا!" ـــــــ وہ کچھ دیر چٹائی پر لیٹا رہا۔ پیاس محسوس کی مگر ہونٹوں پر خشک زبان پھیر کر کروٹ بدل لی۔ اور سوچنے لگا۔ "صبح کو اپنے بیٹے کے ہاتھوں سے دودھ پیوں گا۔ اب کون اٹھے۔ اور یہ بدبودار پانی پیئے!"

بہت دیر یونہی لیٹا رہا۔ اندھیرے میں ایک بھولا بھٹکا پتنگا اڑتا اڑتا اسی کے ماتھے پر آن بیٹھا۔ آنکھ لگ رہی تھی۔ کھل گئی۔ آخر بندوق کی نال کی چمک اور کوئلوں کی آخری جگمگاہٹ کی مدد سے دل کے اندھیرے میں امید کی کرن پیدا کی اور سو گیا۔

اس رات اسے بہت سے خواب آئے۔ ایک بار ایک جگمگاتا ہوا ستارہ ٹوٹا اور روشنی کی کوئی لکیر چھوڑے بغیر اندھیرے میں کھو گیا۔ ایک بار چمکتے دمکتے چاند پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ اور ساری کائنات تاریک ہو گئی۔ ایک بار ایک جھومتے ہوئے پھول کو کسی نے چٹکی میں مسل کر زمین پر پھینک دیا۔ اور ایک بار تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی نامعلوم قوت اس کے دل میں ایک سلاخ چبھو کر پیٹھ کی طرف سے کھینچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ دکھ سے چیخ اٹھا۔ آنکھ کھل گئی، دروازے کی جھریوں سے صبح کاذب کا پھیکا نور نظر آیا۔ خوف اور پیاس سے زبان جڑ تک خشک ہو چکی تھی۔ بڑی مشکل سے اٹھا۔ باسی

بدبودار پانی کا ایک گلاس پی کر دروازہ کھولا۔ اور دہلیز پر بیٹھ گیا۔

دور سڑک پر اسے کچھ سواروں کے سائے سے جاتے دکھائی دیئے کئی بار اسے بجلی کے کھمبوں پر اپنے بیٹے کا گمان ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سب کے سب ایک قطار میں چل پھر رہے ہیں۔ اور ان کے سروں پر دودھ کی بے شمار کٹوریاں ہیں اس کا دل اس زور سے دھڑک رہا تھا کہ جس کواڑ کا وہ سہارا لئے بیٹھا تھا وہ بھی دل کی دھڑکن کے تال پر پیا پے "چخ چخ" بج رہا تھا۔

اب کافی روشنی پھیل چکی تھی۔ سڑکوں پر آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ بوڑھا ہر گزرنے والے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا جاتا تھا۔ سورج ابھر آیا۔ اور وہ ابھی تک دہلیز پر ہی بیٹھا تھا وہی نوجوان سپاہی ٹہلتا ٹہلتا اس کے پاس آیا۔ اور بولا۔

"بابا ابھی تک نہیں آیا تمہارا لڑکا؟"

بوڑھا بولا "ابھی تک تو نہیں آیا۔"

"آجائے گا۔"

"ہاں۔ آجائے گا۔"

"کارخانے میں کس وقت کام شروع ہوتا ہے؟"

"سات بجے۔"

"شاید اب شام کو آئے۔"

"ہاں شاید شام کو آئے۔"

"تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے؟"
"چلو بھر دودھ کی خواہش ہے۔ روز کی عادت ہے نا۔"
"میں لئے آتا ہوں۔"

سپاہی تیز تیز قدم اٹھاتا بازار کی طرف چلا گیا۔ واپس آکر بوڑھے کو دودھ پلایا۔ تسلی دی اور کہا۔ "میری ڈیوٹی ختم ہو گئی ہے۔ اب میں کارخانے جا رہا ہوں۔ تمہارے بیٹے کی خبر لے کر ابھی لوٹوں گا۔ میرے منتظر رہنا۔"

کواڑ سے سر لگا کر بوڑھا بولا۔ "میں گھڑیاں گنوں گا۔ میرے بچے۔ تو کوئی رحمت کا فرشتہ ہے!"

سپاہی الٹے قدم پھرا۔ سیدھی گلی کے کنارے پر سے ایک تازہ اشتہار چسپاں نظر آیا۔

رات کے فساد میں دس آدمی اور دو بچے مارے گئے۔ پانچ مسلمان، پانچ ہندو۔ بچوں کے مذہب کے متعلق اختلاف ہے۔ سات آدمیوں کی شناخت کر لی گئی ہے۔ اور تین آدمیوں اور دو بچوں کی شناخت نہیں ہو سکی۔ دس بجے تک اُن کے وارث کوتوالی پہنچ جائیں۔ ورنہ اس کے بعد انھیں لاوارث سمجھ کر دریا میں بہا دیا جائے گا۔

(۱) پہلا بچہ۔ گورا رنگ۔ صحت مند۔ ناک موٹی سی۔ قریب ہی گلابی رنگ کا جھنجھنا پڑا تھا۔ عمر قریباً ساڑھے تین سال

(۲) دوسرا بچہ۔ سانولا رنگ۔ ٹھوڑی پر پُرانے زخم کا نشان۔ میلا چولا۔ عمر قریباً پانچ سال۔

(۳) ادھیڑ عمر سفید رنگ کا سوٹ پہنے۔

(۴) بوڑھا۔ سفید مونچھیں۔ شریفانہ لباس جیب میں ایک نوجوان کی تصویر۔

(۵) نوجوان۔ پُرانے میلے چیتھڑے۔ ہاتھ میں ٹین کا ڈبہ جس میں سے دودھ کی بو آتی ہے۔

سپاہی کا دل اچھل کر اس کے حلق میں پھنس گیا۔ پلٹ کر دیکھا تو دور سڑک پر نحیف و نزار بوڑھا سڑک پر نگاہیں گاڑے بے جان بت کی طرح بیٹھا تھا۔ سپاہی نے اس پر ہمدردانہ نظریں ڈالیں۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ دو چار قدم واپس چل کر رک گیا۔ ٹھٹکا۔ پاگلوں کی طرح الٹے پاؤں بھاگا اور بھرتی گلیوں میں غائب ہو گیا۔

---

# حیوان اور انسان

زہرہ اور میں دالان کے ایک کونے میں چکنی مٹی کے زیور بنا رہے تھے۔ اور آپا جان ایک بڑے سے ٹوکرے کو ایک کنارے پر کھڑا کئے اور اس کے اوپر کے سرے پر ایک لمبی سی رسی باندھے مکان کے اندر کواڑ کی اوٹ میں بیٹھی تھیں۔ ٹوکرے کے نیچے دانے بکھرے پڑے تھے۔ آپا جان شاید چڑیا کا شکار کھیل رہی تھیں۔

میں نے مٹی کا ایک ہار تیار کیا اور اسے سن کے دھاگے میں پرو کر زہرہ کے گلے میں ڈال دیا۔ زہرہ کے گلابی رخساروں سے جیسے خون پھوٹ نکلے گا۔ لجا گئی بولی۔ "بہت گندہ ہار ہے"۔

میں نے کہا میری انگلیوں کی پوروں میں آبلے ابھر آئے ہیں اور تم ..........."

وہ ہنس دی —— اسے ہار پسند تھا۔ اور میری غلو آمیز تقریر بے کار تھی!

زہرہ نے مٹی کی ایک انگشتری تیار کی جس میں نگینے کی جگہ سبز کانچ کی چوڑی کا ایک ٹکڑا اجڑ دیا۔ اور میری انگلی تھام کر بولی۔ "یہ لو

اپنے ہار کی قیمت۔"

میں نے کہا۔ "بہت گندی انگشتری ہے۔"

وہ بولی۔ "انگشتری بناتے بناتے میرے ہاتھوں میں ——"

میں زور سے ہنس دیا۔ اس نے انگشتری سرکائی۔ انگلی کے پہلے جوڑ پر پہنچ کر اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک نیچے گدلے پانی میں جا گرا اور دوسرا زہرہ ہی کے ہاتھ میں رہ گیا۔ گھبرا کر کچھ کہنا چاہتی تھی کہ "خپ!" کی آواز آئی!

آپا نے چڑیا پکڑ لی تھی!

ہم دونوں بھاگے بھاگے ٹوکرے کے پاس پہنچے۔ آپا کبھی ٹوکرے کے اس طرف اکڑوں بیٹھ جاتیں۔ کبھی اس طرف دب کر زمین سے لگ جاتیں۔ ہاتھ ملتے ہوئے اور کسی دراز سے اندر جھانکتے ہوئے کہتیں۔ "اب کیسے نکالا جائے اسے! ہاتھ کون ڈالے اندر؟ اڑ نہ جائے پھر سے!"

میں نے کہا۔ "زہرہ۔ ذرا ہاتھ ڈالو ٹوکرے کے اندر۔ میں ذرا ——"

بات کاٹ کر بولی۔ "اونہوں! ہم کیوں دوسرے کا پاپ اپنے سر لیں۔ اور پھر مالوس چڑیا ہاتھ پر ٹھونگا لگا بیٹھی تو پہروں رونا پڑے گا!"

آپا بولیں۔ "بزدل!"

زہرہ نے میری طرف اس بے گناہ کی طرح دیکھا جس پر قتل کا الزام بغیر کسی ثبوت کے تھوپا جا رہا ہو، تن کر بولی "میں بزدل ہوں اور تم؟ تم دکن والی چاند بی بی ہو! ہے نا؟"

معاملہ بڑھ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ ڈال کر چڑیا پکڑ لی۔ زہرہ چیخ اٹھی۔ "اے ہے! یہ تو ہمارا چڑا ہے۔ ہمارے باورچیخانے میں رہتا ہے بڑا بھلا مانس ہے، کھلے برتنوں کے سوا اور کہیں چونچ نہ مارے گا ہمارے سروں کے سوا اور کہیں بیٹ نہ پھینکے گا۔ برسوں سے ہمارے یہاں رہتا ہے۔ دیکھو تو دھواں کھاتے کھاتے دھندلا سا گیا ہے بیچارا چھوڑ دو اسے۔ ہماری چڑیا رانڈ ہو جائے گی۔"

آپا جان بولیں۔ "ارادہ تھا کہ گڑیوں کے بیاہ میں اس کے گوشت سے دعوتِ ولیمہ تیار ہو گی مگر تمہارے کہے پر اسے چھوڑ دیتی ہوں —— پر یہ بھی کیا یاد کرے گا کہ کسی کے گھر سے چوری چھپے دانے چگنا اور کسی بچی کی خوبصورت گڑیا کی آنکھ کو باجرے کا دانہ سمجھ کر اس میں چونچ چبھو دینا کتنا بڑا جرم ہے!"

چڑا میری انگلیوں میں جکڑا ہوا یوں آنکھیں گھما رہا تھا، جیسے سب کچھ سمجھ رہا ہے۔ اسے میرے ہاتھ سے چھین کر آپا اندر بھاگ گئیں۔ اور دروازہ بند کر دیا۔ ہم نے بند مٹھیوں سے کواڑ کوٹ دئیے مگر نہ جانے اندر چڑے پر کیا بیت رہی تھی کہ اچانک اندر سے دردناک "چیں چاں چوں" کی مسلسل آوازیں آنے لگیں اور کچھ دیر کے بعد آپا کا

ایک بلند قہقہہ! ہم دونوں حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"آپا ——" میں نے چیخ ماری۔

"عابدہ!" زہرہ پکاری۔

"کھولتی ہوں۔ کھولتی ہوں" —— اندر سے آواز آئی۔ دروازہ کھلا۔ چڑے میاں کے سر پر سرخ ریشم کا ایک پھول سج رہا تھا اور اس کی ننھی سی کھوپڑی پر خون کے دو قطرے چمک رہے تھے۔

زہرہ غم و غصّہ سے بیتاب ہو کر بولی۔ "کیا تم سوئی سے ——!"

—— اور اچانک چڑا پھر سے اڑا بیری پر سے ہوتا شبنمی پر سے گزرتا اور مسجد کی میناروں کی طرف غائب ہو گیا۔

اس دن سے چڑے نے زہرہ کے گھر سے اپنا آشیانہ اٹھا لیا۔ اور شاید کہیں ویرانے میں جا بسا۔ آدم کی ندیدی اولاد سے ڈر کر اس نے بن باس کی ٹھان لی۔ ہمیں وہ بہت عرصے تک کہیں دکھائی نہ دیا۔

اور آخر چار مہینے بعد میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہ وہ چڑا ہمارے باورچی خانے کی چھت میں گھونسلا بنانے کی کوشش میں ہے، رنگ نکھرا ہوا۔ لیکن سر کا پھول میلا اور پنچا کھچا۔ میں بھاگ کر زہرہ کو بلا لایا۔ پڑوس ہی میں رہتی تھی۔

زہرہ کے تو جیسے پر لگ گئے۔ باورچی خانے میں آئی تو چڑا ڈر کر باہر اڑ گیا۔ زہرہ نے تالی پیٹ کر کہا۔ "چڑیا کو لینے گیا ہے!"

میں بولا "اس بوڑھے کے ساتھ کون آئے گی! کوئی بوڑھی کھوسٹ گھسی ہوئی چونچ والی۔ پچی ہوئی دم والی۔ مڑے ہوئے پنجوں والی سینکڑوں چڑیوں کی دادی اماں کہیں سے اٹھالائے گا۔"

زہرہ ہنسنے لگی "کلغی والے کو اپنی کلغی کا احساس تو ضرور ہوگا نا۔"

اور واقعی غروب آفتاب سے چند لمحے پہلے وہ ایک چڑیا ہمراہ لے آیا۔ دودھ کی طرح سفید سینہ شبنم کے قطروں کی سی آنکھیں سونے میں ڈھلے ہوئے پنجے۔ ریشم سے بنے ہوئے پر یوں چوں چیں کرتی تھی جیسے دور کوئی جلترنگ بجا رہا ہو۔ کچھ دیر باہر منڈیر پر بیٹھے رہے۔ پھر اندر آگئے۔ اور چھت میں شہتیروں کے آس پاس یوں سما گئے جیسے مستری نے انھیں کے لئے یہ جگہ خالی چھوڑ دی تھی۔

دو سال وہ ہمارے یہاں رہے۔ گرمیوں میں باہر روشندانوں میں آجاتے، سردیوں میں اندر شہتیروں کے آس پاس گھس جاتے۔ ہم سے یوں ہل گئے کہ ایک بار زہرہ نے عابد کے کہنے پر چڑے کو پکڑ لیا۔ اور اس کے سر کا پھول تازہ کرنا چاہا۔ مگر وہ دردناک انداز میں چیخ اٹھا۔ اوپر سے چڑیا جس کا رنگ باورچی خانے کے دھوئیں سے میلا پڑ گیا تھا۔ چیختی ہوئی اڑی اور منڈیر پر بیٹھ کر ہمیں گھورنے لگی۔ ہم نے چڑے کو چھوڑا تو وہ سیدھا اپنی بیگم کے پاس جا بیٹھا۔ اور دونوں نے پھدک پھدک کر یوں رازدارانہ انداز میں

چیخ چیخ کر جیسے کہہ رہے ہیں "پگلی۔ تو کیوں چیخ اٹھی۔ ہم دو سالوں سے ان کا نمک کھا رہے ہیں۔ یہ ہمیں ہرگز نہیں پہنچائیں گے۔ پگلی!" ——— "میں سمجھی تمہیں مروڑ ڈالیں گے۔ اللہ قسم میں ڈر گئی تھی!" ——— "اٹھ! پگلی!"

میں باہر سیر پر جاتا۔ اور وہ چھڑا کہیں نظر پڑتا تو میں پکار اٹھتا۔ "وہ رہا وہ رہا ہمارا چھڑا!" ——— میرے ساتھی زور زور سے ہنستے ہوئے کہتے "کیا دماغ چل گیا ہے تمہارا؟ سارے شہر میں تمہارے چھڑے کے تذکرے ہیں۔ ایک تو بے چارے کا سر چھید ڈالا۔ اوپر سے اتنا بدنام کیا کہ بچے اسے آنگنوں میں چین سے پیٹ تک نہیں بھرنے دیتے۔ اگر کسی شریر چھوکرے کے ہتھے چڑھ گیا تو کلغی کھینچ کھانچ کر چھچھوندر بنا دیں گے تمہارے چھڑے کو!

اور میں بھڑک کر کہتا۔ "کوئی چھیڑے تو میرے چھڑے کو قسم خدا کی الٹا لٹکا دوں اسٹیشن کے پل سے!"

زہرہ کی بھی یہی حالت تھی۔ سہیلیوں میں بیٹھی کشیدہ کاڑھ رہی ہوتی، پکار کر کہتی۔ "وہ رہا ہمارا چھڑا!"

سہیلیاں ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر کہتیں۔ "اے ہے۔ رہنے بھی دے ہمارا چھڑا۔ ہمارا چھڑا ——— کوئی سن پائے تو کہے۔ زہرہ چھڑے سے بیاہ رچانے والی ہے!"

اور زہرہ کڑک کر کہتی۔ "منہ سنبھال کر بات کرو بھئی ——— کوئی دکھائے تو ایسا پیارا چھڑا۔"

سہیلیاں زور زور سے ہنستیں۔ فضا میں نقرئی قہقہے پھلجھڑیوں کی طرح بکھر جاتے، اور چڑا مبہوت ہو کر وہاں سے اڑ جاتا۔

ایک روز چڑا اور چڑیا برآمدے کے باہر چوبی کٹہرے پر بیٹھے تھے، اچانک چڑیا پھدکتی ہوئی آئی اور چڑے کے سر کے پھول میں چونچ پھیرنے لگی۔ چڑا آنکھیں بند کئے دم بخود بیٹھا رہا۔ جب یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا تو میں تیزی سے اٹھا کہ زہرہ کو بلا لاؤں اور اسے یہ اچھوتا منظر دکھاؤں، کہ اچانک عابدہ بولی۔ "بھیّا امی بلا رہی ہیں۔"

میں پلٹ کر اندر کمرے میں گیا۔ امی نے مجھے اپنے قریب بٹھا کر کہا۔ "کدھر چلے تھے؟"

"زہرہ کو بلانے۔"

"کیوں؟"

"چڑے چڑیا کا کھیل دکھانے۔"

"کیوں؟"

"یونہی۔"

تم اب دودھ پیتے بچے نہیں بیٹا۔ اللہ رکھے گبرو ہو، سوچ سمجھ سکتے ہو، یہ بھی جانتے ہو کہ زہرہ کے ماں باپ سے ہم تمہارے متعلق بات چیت کر رہے ہیں۔ اب تم اس کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلنا چھوڑ دو، کل اس کی ماں بھی یہی کہہ رہی تھی، تمہارا ادھر جانا ٹھیک نہیں۔ لوگ ہنستے ہیں!"

میں سر جھکائے باہر آیا تو عابدہ دوپٹے میں ناک چھپائے دیوار سے لگے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھا تو بولی "کیوں بھائی جان۔ کیا حال ہے؟"

اندر سے امی پکاریں۔ "عابدہ تو بھی اپنے بھائی کی طرح بچہ ہی ہے، چپ رہ۔"

اور میں نے عابدہ سے پوچھا "کیوں آپا جان۔ کیا حال ہے؟"

——— ہم دونوں ہنسنے لگے۔ مگر میری ہنسی کھوکھلی تھی۔ جیسے خالی پیٹ بجتا ہے۔"

میں نے بہت دنوں تک زہرہ کو نہ دیکھا تھا۔ اور ایک رات جب چاند افق کو مس کر رہا تھا۔ دکھی دکھی چاندنی فرطِ غم سے سمٹی جا رہی تھی۔ میں نے زہرہ کو گلی کے نکڑ پر مڑتے دیکھا۔ لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ اس کے بال جو دھوئے جانے کے بعد گوندھے نہیں گئے تھے اس کے نصف چہرے کو چھپائے ہوئے تھے اور اس کے ہونٹوں کے کنارے پل پل بھر کپکپا اٹھتے تھے۔

میں نے اسے ساتھ ساتھ آنے کا اشارہ کیا تو وہ فرمانبردار شاگرد کی طرح میرے پیچھے پیچھے ہو لی، شدت کے جاڑے میں بھی وہ پسینے میں شرابور تھی، چاند کی غمگین روشنی جو اس کے چہرے پر پڑی تو میں سمجھا کہ بابل اور نینوا کی کوئی شاہزادی حاجبوں کی نظروں سے کترا کر کسی چور دروازے سے نکل آئی ہے اور اپنے محبوب کو ملنے آئی ہے!

ہم چھت پر ٹھٹھرتے ہوئے جا بیٹھے۔ میں نے کہا زہرہ۔ نہ یہ

شکریہ ادا کرنے کا موقع ہے نہ چڑے چڑیا کی باتیں کرنے کا۔ میں صرف یہی کہنا چاہتا ہوں کہ اب وہ دن بیت گئے۔ جب ہم مٹی کے زیور بناتے تھے۔ چڑیوں کے پیچھے بھاگتے تھے۔ رنگ رنگ کی تتلیاں پکڑتے تھے۔ نہ کوئی روکنے ٹوکنے والا۔ نہ کوئی پوچھ گچھ کرنے والا اور اب یہ حالت ہے کہ ہمارا ایک دوسرے کو دیکھنا بھی گناہ سمجھا جاتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ شہر کے ایک اور صاحب بھی اپنے بیٹے کے لئے تمہارے ماں باپ سے تمہارے متعلق بات چیت کر رہے ہیں۔ زہرہ۔ کیا تم برداشت کر لوگی کہ ہم الگ الگ پھینک دیئے جائیں۔ ہم بچپن سے ایک ساتھ رہے ہیں۔ اس لئے میں زہرہ کے حسن کا اتنا پجاری نہیں جتنا زہرہ کا۔ وہی زہرہ جس نے میری انگلی میں ——— مدتیں گزریں ——— مٹی کی ایک انگوٹھی ڈالی تھی۔"

"اور وہ ٹوٹ گئی تھی!"۔ زہرہ پہلی بار بولی۔ جیسے کسی نادان بچے نے بے جانے بوجھے سارنگی کے کسی تنے ہوئے تار کو چھیڑ دیا ہو۔" میں گھبرا گیا۔

زہرہ پھر بولی۔ "تم چپ ہو گئے۔ بات یہ ہے کہ اس قسم کی قربانیاں کرتے وقت مرد سے زیادہ عورت کی روح پر چرکے لگتے ہیں، وہ پنجرے میں بند ایک چڑیا ہے۔ نکل نہیں سکتی۔ اور کسی رخنے سے نکلے گی تو اپنے پر زخمی کر لے گی۔ اور پھر اڑنے کے ناقابل

ہو جائے گی۔ رینگے گی۔ اور تم جانتے ہو۔ صرف رینگنے سے چڑیاں آشیانوں میں نہیں پہنچ سکتیں۔"

"پر پھر بڑھ آتے ہیں" میں نے کہا۔

"پروں کے بڑھنے کا انتظار کون کرے!" زہرہ نے اپنا خوبصورت سر ادھر ادھر ہلاتے ہوئے کہا "کوئی نہیں کرتا۔"

کنول کے پھول کے سے نرم اور بھیگے بھیگے ہاتھ کو میں نے اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ "یہ چڑا اور چڑیا جو ہمارے باورچیخانے میں رہتے ہیں۔ حادثاتِ زمانہ کا مقابلہ کرتے ہیں۔ مصیبتیں جھیلتے ہیں دکھ بھگتے ہیں۔ مگر جدا نہیں ہوتے۔ روزانہ کتنی شوخ اور چنچل چڑیاں ہمارے کلغی والے چڑے کے اردگرد منڈلاتی ہوں گی۔ مگر اسے اپنی چڑیا کے پہلو کے سوا کہیں قرار نصیب نہیں۔ یہ حیوان ہے۔ ہم انسان ہیں۔ مگر اتنے بے بس کیوں ہیں!"

زہرہ شاید چڑے چڑیا کی باتیں سن کر متاثر ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "اگر انسان حیوانوں کی تقلید کر سکتے تو فرشتے بن جاتے۔"

چاند ڈوب گیا تھا۔ رات حیران سی رہ گئی تھی۔ شہر سے دور بڑی سڑک پر کوئی شخص ٹارچ کو روشن کئے جا رہا تھا۔ زہرہ اٹھی جاتے ہوئے بولی۔ "اپنے کہے کا پاس رہے۔"

میں نے سمجھا اس نے میرے کلیجے کو چٹکیوں سے نوچ لیا ہے۔

میرا جی الٹنے لگا۔ شک و شبہ میں لپٹی ہوئی محبت کا انجام معلوم!

چڑے چڑیا کی سنئے۔ ایک روز چڑیا صبح باہر نکلی تو گھبرائی ہوئی سی آٹھ دس گز اڑ کر فرش پر بیٹھ گئی۔ آنکھیں میچ لیں۔ گردن جھکالی لمحہ بھر بعد ہشیار ہو کر اڑی۔ منڈیر پر جا بیٹھی۔ آنکھیں بند کر کے اونگھنے سی لگی۔ چڑا لمبے لمبے چکر کاٹ کر اس کے پاس آتا اور چیختا ہوا اوپر فضا میں قلابازیاں سی کھاتا پھر نیچے آجاتا۔ بہت دیر تک چڑیا کی یہی حالت رہی۔ کبھی فرش پر ہے تو کبھی منڈیر پر۔ کبھی اونگ رہی ہے تو کبھی نیچے گھسیٹ کر چل رہی ہے، میں اور آپا بے سدھ بیٹھے دیکھتے رہے ہمارے دل ہوا ہو گئے۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ چڑیا دو ایک بار جھولی لڑکھڑائی ایک طرف لڑک کر پنجے سمیٹے اور پر ڈھیلے چھوڑ دیئے، چونچ کھولی اور وہ کھلی کی کھلی رہ گئی چڑیا ختم ہو چکی تھی!

چڑا بیچارہ اس قدر چیخا کہ امی تنگ آگئیں۔ دست پناہ اٹھا کر پھینکنا چاہا تو میں نے کہا "امی۔ دیکھئے تو۔ آج بیچاری چڑیا مر گئی ہے، اسے چیخنے دیجئے اسے۔ کل کلاں یہ بھی چل دیگا۔ دو اڑھائی سال اس کے ساتھ گزارہ کر اب اکیلے کیسے جئے گا یہ بد قسمت —— بدنصیب!"

عابدہ تو ہچکیاں لے لے کر رونے لگی!

زہرہ ان دنوں بیمار تھی۔ میں اس خیال سے بے حد پریشان تھا اسے کیسے اطلاع دوں، خوش قسمتی سے اس روز اس کے ابا اسے

ہمارے ہاں اٹھوا لائے، کہ کھلا صحن ہے، تازہ ہوا کھائے گی بیچاری وہاں اپنے گھر میں تو اس کا دم گھٹا جاتا تھا۔ امّی اور ابا جان کیلئے یہ بالکل معمولی بات تھی۔ وہ زہرہ کے لئے گھر کا گھر خالی کر سکتے تھے۔ کیونکہ انھیں یقین تھا کہ زہرہ ان کی بہو بنے گی مجھے اس روز اوپر کے ایک کمرے میں رہنے کو کہہ دیا گیا۔

موقع پا کر ایک بار زہرہ کو دیکھا تو جیسے چاند گہن میں آگیا ہے۔ وہ رنگ کیا ہوا۔ وہ بال کدھر گئے۔ وہ بھری بھری باہوں کے خطوط اور وہ مرمریں گردن کا تناؤ! —— الہٰی! کیا انسان کو اتنا خوبصورت بنا کر اتنا —— لیکن میں زہرہ کے حسن کا پجاری نہ تھا۔ میں صرف زہرہ کا پجاری تھا۔ اور وہی زہرہ میرے سامنے موجود تھی۔

شام کے قریب جب سب عورتیں اپنے کام کاج میں لگ گئیں تو میں زہرہ کے پاس آیا اور اسے چڑیا کی موت کا قصّہ سنایا۔

اس کے بے رونق ہونٹ کھل گئے۔ بڑی بڑی ویران آنکھیں بھیگ گئیں۔ کروٹ بدل کر بولی "خدا خیر کرے!"

میں کچھ نہ سمجھا!

میں نے چڑیا کی قبر بنائی اور اس پر سبز رنگ کا غلاف بھی چڑھا دیا۔

چڑا بیچارہ متواتر دو دن منڈیر پہ بیٹھا اونگھتا رہا نہ کھاتا تھا نہ پیتا تھا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ آپا عابدہ اور میں اس کی حالت پر

گھنٹوں افسوس کرتے اور جب کبھی زہرہ اس کی طرف دیکھ لیتی تو بےچین سی کروٹ بدل کر کہتی "خدا خیر کرے"!

تیسرے دن وہ منڈیر سے اڑ کر شہنشی پر جا بیٹھا۔ اور پھر کر تا پڑتا دوسری طرف اڑ گیا۔ چار روز کے بعد ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کلغی والا چڑا منڈیر پر بیٹھا چوں چوں کر رہا ہے اور اس کے پہلو میں ایک گوری چٹی بے آرام سی چڑیا پھدکتی پھر رہی ہے!

زہرہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ عابدہ چہرے پر آنچل پھیلائے اندر بھاگ گئی۔ میں نے زہرہ کو اکیلا پا کر کہا "زہرہ۔ کتنا بیوفا نکلا چڑا!"۔

بازو اٹھا کر آنکھوں پر رکھتے ہوئے بولی "خدا خیر کرے۔"

میں کچھ نہ سمجھا!

زہرہ کی حالت بہت نازک ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی رنگت خوفناک حد تک سفید پڑ گئی تھی۔ زندگی جیسے اس کی حیران پتلیوں اور پژمردہ پپوٹوں میں سمٹ آئی تھی۔ اس کے سیپی کے سے سفید ناخن۔ اس کے اکا دکا نچے کھچے بال۔ اس کے مٹیالے دانت پیشانی کی ابھری ہوئی ہڈی۔ دھنسی ہوئی آنکھیں —— جیسے جنگل کا پھول جسے آندھیوں نے گرد و غبار سے اٹ دیا ہو!

میرا جی دہل جاتا۔ میرے ذہن میں زہرہ کے وجود اور زہرہ کے حسن میں کبھی نہ ختم ہونے والا مباحثہ شروع ہو جاتا۔ اور جب میں کسی

نتیجے پر نہ پہنچ سکتا تو گھبرا کر باہر گلیوں میں نکل جاتا اور اس تیزی سے چلتا کہ لوگ دانتوں سے اپنی انگلیاں کاٹ لیتے۔

ایک روز جب سب گھر والے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ زہرہ نے مجھے سوکھے ہوئے ہاتھ سے اپنی طرف بلایا۔ اور اور جب میں اس کے پنجر پر جھک گیا تو وہ سرگوشی کرتی ہوئی بولی "چڑے چڑیا کی مثال پیش کرتے ہوئے شاید انجام تمہاری نظروں میں نہ تھا۔ چڑیا چل بسی۔ چڑا دوسری چڑیا لے آیا۔ دنیا کا یہ پرانا قانون ہے۔ کون کسی مرنے والے کے لئے اپنا جی ہلکان کرتا پھرا۔ تم میری حالت دیکھ کر روتے ہو، میں تمہیں دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہوں۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ چڑے کی طرح دو ایک بار منڈیر پر اونگو اور پھر ——"

میرے گلے میں گرہ سی پڑ گئی۔ اٹھ کر باہر جانے لگا تو وہ بولی۔ کہاں چلے۔ پوری بات تو سن لی ہوتی۔"

میں نے پلٹ کر پوچھا۔ "کہو۔"

"کچھ نہیں" وہ بولی۔ "تم سب سمجھتے ہو۔"

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اور میرے سر میں نکیلا کنکر سا بجنے لگا۔

دوسرے روز زہرہ کی حالت بے حد خطرناک ہو گئی۔ اس کے والدین اسے اپنے گھر لے گئے کہ وہ اپنے بزرگوں کی جگہ پر دم توڑے

مجھے اس روز ابا نے دو مہینوں کے لئے چچا جان کے ہاں لاہور بھیج دیا۔ کام کی نوعیت سوائے اس کے اور کوئی نہ تھی کہ چچا جان مجھے دیکھنا چاہتے تھے،

لاہور پہنچا تو چچا جان کی بڑی لڑکی نجمہ ہر وقت میرے سامنے رہنے لگی، اس پر مستزاد یہ کہ میرے اور اس کے کمرے میں صرف ایک دروازہ حائل تھا، جس میں لکڑی تھوڑی تھی اور صاف شفاف شیشے زیادہ، دروازے پر پردہ لٹکانے کا تکلف بھی غیر ضروری سمجھا گیا!

جب صوفے پر لیٹے لیٹے میری نظریں نجمہ کے کمرے میں پڑتیں تو وہ مجھے ٹک ٹک گھور رہی ہوتی، دو تین روز تو آنکھیں جھپکا کر ایک طرف مڑ جانے میں گزر گئے۔ مگر آخر کہاں تک!

نجمہ اور زہرہ کے ہیولے آپس میں ٹکرائے۔ دھوئیں کا ایک بونا سا اٹھا اور میرے حواس پر چھا گیا۔ میں نے سوچا۔ زہرہ تو میرے چلے آنے کے دوسرے روز ہی دم توڑ چکی ہوگی۔ زندگی زندہ رہنے کے لئے ہے، وقت اچھا گزر گیا۔ اب کون محبت کی لاش اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھرے!

نجمہ کا جدید حسن زہرہ کے قدیم حسن پر چھا گیا۔ اور اسی لئے ایک روز ہمارے کمروں کے درمیان سے دروازے کا پردہ بھی اٹھ گیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جونہی زہرہ کے مرض نے طول پکڑا

اباجان نے ادھر بات چیت کی اور چچا جان نے انھیں لکھا کہ جب تک نجمہ مجھے دیکھ نہ لے وہ نہیں مانتی ہے ——— اور اب نجمہ نے مجھے دیکھ اور سمجھ لیا تھا!

میں واپس گھر آیا تو معلوم ہوا کہ زہرہ میرے جانے کے بعد اچانک اچھی ہونے لگی اور اب بھلی چنگی ہے، گھر کے کام کاج آپ ہی کرتی ہے۔ کل پڑوس میں ہنس رہی تھی۔

میں لڑکھڑا گیا۔ پلنگ پر گرا تو کانوں میں کوئی پھنکارنے لگا۔

"کلغی والے کو اپنی کلغی کا احساس تو ضرور ہوگا نا۔"

"پروں کے بڑھنے کا انتظار کون کرے۔"

"اپنے کہے کا پاس رہے۔"

اور جب صبح کو امی نے مجھے نہایت محبت سے یہ خوش خبری سنائی کہ عنقریب نجمہ سے شادی ہو جائے گی۔ تو میں بے سوچے سمجھے پکار اٹھا۔ "میں نجمہ سے شادی نہیں کروں گا۔ میرا بیاہ زہرہ سے ہوگا۔"

دوسرے کمرے میں والد صاحب بیٹھے تھے۔ بھاگے آئے اور پکارے۔ "کیا کہا؟"

میں نے آنکھیں فرش پر گاڑ کر کہا۔ "میں زہرہ سے بیاہ کروں گا"

گھر بھر میں میری اس گستاخی کے چرچے ہونے لگے میرے والدین خاموش اور حیرت زدہ ہو کر ایک اندھیرے کمرے میں بیٹھ رہے۔

میں شام کو اپنے مکان سے باہر اکیلا کھڑا تھا کہ ایک لڑکی میرے قریب آئی اور ادھر ادھر دیکھ کر بولی "سنئے گا"۔

میں اس کے قریب آ گیا۔

بولی۔ "زہرہ کہہ رہی ہیں۔ تم اپنے ماں باپ کا دل برا نہ کرو۔ اور نجمہ سے بیاہ کر لو۔ مجھ سے ناامید ہو جاؤ۔ میں تم سے شادی کر لینے پر کنوارپنے کو ترجیح دیتی ہوں"۔

وہ یہ کہہ کر چلی گئی۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں ایک سایہ سا فضا میں تیرتا ہوا آیا۔ اور میرے کانوں میں بھنکارنے لگا۔ "مایوس چڑیا ہاتھ پر ٹھونگا لگا بیٹھی تو پہروں رونا پڑے گا!"

میں بے قابو ہو کر کوڑے کے ایک ڈھیر پر گر گیا۔ اور کلغی والا چڑا اوپر منڈیر پر بیٹھ کر چر چوں چوں مجھ پر پھبتیاں کسنے لگا!

# ہسپتال سے نکل کر!

نمائش گاہ کے صدر دروازے سے بھنے ٹھنے لوگوں کا ایک سیلاب اندر بہا چلا جا رہا تھا۔ میں نے ٹکٹ تو خرید لیا تھا مگر اس ہجوم میں گھسنے سے ہچکچا رہا تھا۔ دراصل بھوک کے متواتر صدموں سے میری پسلیاں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ اور مجھے ہر لمحہ ان کے چٹخ جانے کا خیال دامن گیر رہتا تھا۔ بازار میں سے گزرتے ہوئے جب مجھ سے کسی تیز رو جنٹلمین کا کاندھا ٹکرا جاتا تو میں اپنا توازن کھو بیٹھتا اور لوگ میرے ڈگمگاتے ہوئے قدم دیکھ کر کہتے "شرابی ہے!"

مگر شراب کا تو ذکر ہی فضول ہے ان دنوں جب مجھے کسی ریستوران سے سوڈے کی بوتل کی کھڑاک سے کھلنے کی آواز آتی اور شیشے کی گولی بوتل کے حلق میں جلترنگ سا چھیڑ دیتی۔ یا دہی کی لسی کی شڑاپ خڑاپ سے کوئی دکان گونج رہی ہوتی تو میں سوچا کرتا کہ خدا نے یہ نعمتیں محدود کیوں کر دی ہیں۔ اس کی رحمت کی تقسیم اگر ایسی ہی بے پروایانہ انداز کی ہے تو بڑے افسوس کی بات ہے!

آہستہ آہستہ وقت نے میرے احساس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی

میں پہلے کی طرح دیکھتا۔ سوچتا اور محسوس کرتا تھا مگر مجھے اس سوچ۔ اس احساس میں لذّت سی ملتی تھی۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ میں خودکشی کرنے سے باز رہا۔

اسی لاہور میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے کئی بار مجھے پرانے احباب مل جاتے آنکھیں پھاڑ کر مجھے گھورتے اور پوچھتے "ارے! خدانخواستہ تمھیں تپ دق تو نہیں؟"

میں کہتا۔"خدا جانے کیا بات ہے، طبیعت گری گری رہتی ہے۔ کچھ دنوں سے ہلکا ہلکا بخار بھی آرہا ہے۔ کھانسی کی بھی شکایت ہے، کل میں نے اپنی تھوک میں خون دیکھا تھا"—— اور میں کھانستا!

میرے احباب یوں پرے سرکنے لگتے جیسے انھوں نے دق کے جراثیم میرے جسم سے اڑتے اور اپنی طرف لپکتے دیکھ لئے ہیں! دور سے کہتے "بھئی فکر کرو اپنی صحت کا۔ یہ بے پروائی ٹھیک نہیں۔ اچھا۔ آداب عرض۔ بہت ضروری کام ہے!"

میں جی ہی جی میں نسل انسانی کے اس خوف پر ہنستا جو اسکے دماغ پر موت نے مسلط کر رکھا ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ موت یقینی ہے۔ اگر ان احباب میں سے کوئی صاحب اتفاق سے دوبارہ کہیں مل جاتے تو میں ان کی حرکات کا نہایت دلچسپی سے مطالعہ کرتا۔ وہ موٹے موٹے سیٹھوں کے پیچھے چھپتے چھپاتے۔ آنکھیں نیچے سڑک پر گاڑے کنکھیوں سے گاہے گاہے مجھے دیکھتے دوسری جانب کی

دکانوں کے تختوں سے چمٹتے ہوئے گزرنے لگتے۔ میں محض لذت حاصل کرنے کے لئے کہتا۔ "السلام علیکم حضرت!"

"وعلیکم السلام" کے حروف ان کے لرزتے ہوئے لبوں پر غضبناک بھڑوں کی طرح بھنبھناتے اور یوں حیران نگاہوں سے دیکھتے جیسے میں نے انھیں اچانک سر کے بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھالیا ہے!

میں کہتا۔ "آئیے نا۔ کہاں بھاگے جارہے ہیں آپ؟"

وہیں سے کہتے۔ "اجی بھاگنا واگنا کیا! مجھے ایک ضروری کام ہے ادھر میو ہسپتال میں ——— مدر نے اوپریشن کرایا ہے ——— اچھا۔ السلام علیکم"۔

یعنی تم پر خدا کی لعنت ——— میں جی ہی جی میں ان پر ہنستا

اب میری بے سرو سامانیاں میرے لئے سامانِ راحت نہیں ہیں سوچا کرتا تھا کہ مسرت اور غم کو اگر آپس میں مدغم کر دیا جائے تو اس احساس کا مقابلہ نہ مسرت کر سکتی ہے اور نہ غم!

ہاں! جب دو دو تین تین دن کھانے کو کچھ نہ ملے۔ ایک پیسے کے بھونے ہوئے نمکین چنوں اور کمیٹی کے نلکے کے کھولتے ہوئے پانی کے سوا ——— موسمِ گرما میں! ——— اور جب کڑکتی دوپہروں کو تپتی سڑکوں پر بے مقصد چلتے ہوئے جھلستے ہوئے ہونٹوں اور چٹختے ہوئے حلق کو راحت پہنچانے کے لئے صرف برف والے کی ہانک پر اکتفا کر لیا جائے! نیز جب اندھیری شاموں کے روح فرسا

حبس میں ایک تنگ کوٹھری میں ایک ٹوٹے پھوٹے کھٹولے پر لیٹ کر سونے کی کوشش میں ایڑیاں رگڑی جائیں۔ تو اس وقت میرے دماغ پر دو احساسات مستولی ہو جاتے ہیں! —— بغاوت یا موت —— یا تو انسان قدرت کے ہر قانون کے خلاف بغاوت کرے اور اپنے ہر ہمجنس کو باغی بنائے! —— یا ایک تیز چھرا کلیجے میں گھونپ کر دو ایک بار تڑپے اور ٹھنڈا ہو جائے!

مگر میں ابھی تک ان دو احساسات کے عین وسط میں معلق تھا نہ مجھ میں مرنے کی ہمت تھی نہ بغاوت کی جرأت! قبر کے حبس کا تصوّر ہی میرا دم گھونٹ دیتا تھا اور جیلوں کی زندگی سے میں ایک سوشلسٹ دوست کی زبانی بخوبی آشنا ہو چکا تھا! —— اپنی بے رنگ و بو زندگی کے دونوں کنارے میرے سامنے تھے۔ بس ایک تیز موج کا انتظار تھا۔ پرسکون اندھیرے میں لے جائے یا بھڑکتے ہوئے شعلوں میں! موت کی طرف لے جائے یا بغاوت کی طرف! —— میں مذبذب حالت میں زندگی کے ڈولتے ہوئے بجرے کو فی الحال بہاؤ پر لئے جاتا تھا!

میں نے اس روز دو روپے کمائے تھے! —— مدت کے بعد میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا —— بہت مدت کے بعد —— ! کھا چکا تو اتنی لمبی ڈکار آئی کہ ہوٹل والے کے ہاتھ سے ایک پلیٹ فرش پر گر کر چور ہو گئی۔ ہوٹل کی سیڑھیاں اترا تو مجھے ایک اور بھاری

ڈکار آئی۔ اور ایک سائیکل سوار لڑھکتے ہوئے ایک سیٹھ پہ جا گرا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اچھی خاصی بھیڑ لگ گئی۔ اور میں مسکراتا ہوا آگے نکل گیا!

دراصل میں اب نیک و بد کی الجھنوں سے بلند ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا۔ لڑتے ہیں لڑنے دو۔ ان بے فکروں کو تو لڑ کر مر جانا چاہیئے تاکہ کوئی سائیکل فارغ ہو سکے، کوئی کوٹھی خالی ہو جائے! لڑنے دو! —— آج مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ دو جماعتوں کو آپس میں لڑا دینا کتنا آسان ہے، ایک لمبی ڈکار لو اور سننے والوں کے اوسان خطا کر دو۔ وہ لڑیں گے تم ہنسنا، یہ بھی تو آخر انتقام کا ایک پہلو ہے!

نمائش دیکھنے کے لئے مدت سے طبیعت بے کل تھی۔ ٹکٹ خرید کر میں ایک طرف کھڑا ہو گیا کہ بھیڑ کم ہو تو اندر جاؤں۔ مگر ابھی تک اسی طرح کھوے سے کھوا اچھل رہا تھا۔ اور مہین ریشمی ساڑھیاں اجلی پتلونوں میں خلط ملط ہو رہی تھیں! میں تنگ آکر اپنے آس پاس دیکھنے لگا۔ مجھ سے چند ہی قدم کے فاصلے پر ایک شیشم کے نیچے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس کے سر پہ سرخ ٹوپی تھی۔ جس کے کناروں پر دو دو انچ میل جما ہوا تھا۔ خشک بال ٹوپی کے نیچے سے نکل کر اس کے کانوں اور گردن پہ پھیل رہے تھے۔ کپڑوں میں کئی پیوند لگے ہوئے تھے۔ بوٹوں سے اس کی انگلیاں باہر جھانک رہی تھیں۔

اور لستموں کی جگہ ان میں سن کے دھاگے پڑے تھے، اس کے ہونٹ سوکھے پتوں کی طرح لرز رہے تھے اور آنکھیں بھیگ رہی تھیں!

مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے سر جھکا لیا اور زمین کو گھورنے لگا۔ جھنجلا کر بیٹھ گیا اور پھر اٹھ کر بھیڑ کے قریب ٹھوڑی کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں نمائش گاہ کے بڑے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔

شاید میں اس کی طرف اتنی توجہ نہ دیتا، مگر نمائش گاہ میں آنے جانے والوں کے مقابلہ میں اس کا وجود کچلے ہوئے چوہے سے بھی کمتر محسوس ہوا۔ جی چاہا۔ بڑھ کر اُسے تسلّی دوں۔ مگر اب لوگوں کا ریلا کم ہو گیا تھا اور ہمدردی جتانے کی مجھے فرصت نہیں تھی موقع غنیمت جانا۔ لپکا۔ ٹکٹ دکھایا اور آگے بڑھ گیا!

اندر کی دنیا ہی الگ تھی۔ زرق برق ساڑیاں کئی قمر پاروں کو اپنے ہالے میں لئے لہراتی پھر رہی تھیں۔ نیلے اور گلابی برقعوں والی خواتین برقعوں کو بغل میں دبائے دکانداروں سے ہمکلام تھیں جیسے پردے کی حدود نمائش گاہ کے گیٹ تک آکر ختم ہو جاتی ہیں، اور اس چار دیواری میں خدا کا قانون رائج نہیں!

میں یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے ایک تیز رفتار بابو کا کاندھا لگا اور میں اچھل کر ایک مٹھائی والے کے تختے پر جا گرا!

"ابے گرنے کی یہی جگہ ہے؟ وہ نالی نہیں نظر آئی تجھے؟——

موٹے حلوائی نے دائیں ہاتھ سے ناک صاف کر کے اسی ہاتھ سے جلیبیاں ڈھالنا شروع کر دیں۔ "آجاتے ہیں وہاں سے سیر کرنے آوارہ کہیں کے!"

میں وہاں سے مسکراتا ہوا اٹھا۔ ایک عطار کی دکان پر گاہکوں کا ہجوم تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "یہ چھوٹی بوتل ——"

"ہاتھ مت لگاؤ" وہ کڑکا اور سب گاہک مجھے گھورنے لگے!

اور اگر میں ان سب بوتلوں کو گھونسوں سے توڑ دوں اور پاؤں سے روند ڈالوں!

سامنے ایک بزاز کی دکان تھی، دیویوں کے ہجوم سے ایک طرف ہو کر میں نے ایک کپڑے کو چھوا اور پوچھا "یہ کپڑا ——"

"تم نہیں خرید سکتے" بڑی بڑی مونچھوں والا سیٹھ بولا۔ "دھجیاں یہاں رکھی ہیں اور سن پروف کو ہاتھ لگاتا ہے! کنگلا!"

نرخ پوچھنے کے بجائے سیر کرنا زیادہ آسان رہے گا میں نے سوچا۔ یہ دکاندار کمبخت نہ جانے کیسے بھانپ لیتے ہیں!

میری جیب میں سوا روپیہ تڑپ رہا تھا!

میں ایک اور روش پر ہوں۔ مختلف ریاستوں کے حصے جنہیں شیروں اور ہرنوں کے سر۔ بیش بہا غالیچے اور بے شمار دیگر چیزیں رکھی ہیں! —— اور اگر ان کا خرچ غریب ریاستوں پر تقسیم کر دیا جاتا!

دیہاتی لوگوں کے لئے نمونے کے مکانات جن پر دو دو ہزار روپے سے کم خرچ نہ آتا تھا! رقم نہ ہو تو انجمن امداد باہمی سے قرضہ لو اور اگر قرضہ ادا نہ کر سکو تو گھر اور زمین قرق!

کارخانے! ــــ کالے کالے چہرے ــــ پسینے سے شرابور۔ مشینوں کی شپاشپ ــــ چمنیوں سے ابلتا ہوا گاڑھا دھواں ــــ ایک طرف خوبصورت سوٹ پہنے ہوئے "سفید چہرے جن کے لبوں میں ایک ایک سگار لٹک رہا تھا!

تھیٹر ــــ گانے سنو۔ ناچ دیکھو۔ لطف اٹھاؤ ــــ ایک ایک ٹکٹ میں دو مزے ــــ "ٹکٹ؟" میں نے پوچھا۔

"دو روپئے۔" جواب ملا۔ میرا سوا روپیہ میری جیب میں تڑپ اٹھا!

میرا دماغ دہکنے لگا۔ میرے جی میں آئی۔ میں ان دکانوں کو آگ لگا دوں۔ اور نمائش گاہ کے عین وسط میں دیوانوں کی طرح تالیاں بجا بجا کر ناچوں اور چیخوں ــــ اور جب ان دکانوں کے مالکوں کے سروں کے پھٹنے کی آوازیں آئیں تو میں فتح کے اونچے اونچے نعرے لگاؤں اور جب سب کچھ بھسم ہو کر رہ جائے اور نمائش گاہ میں راکھ ہی راکھ اڑتی دکھائی دے تو یہاں سے نکل کر سارے شہر کو آگ لگا دوں۔ ساری دنیا کو آگ لگا دوں ــــ ساری کائنات کو آگ لگا دوں ــــ نامکمل دنیا ــــ ادھوری کائنات!

میرا دماغ تپ گیا!

سامنے ایک ہوٹل نظر آیا جس کے سامنے ایک بورڈ آویزاں تھا۔ ''ایک پیالی دو پیسے میں!'' ——— میں لپک کر اندر چلا گیا۔ اور ایک میز پر جا کر بیٹھ گیا۔

''کیا چاہئے بابو؟'' منیجر نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''ایک کپ چائے۔''

''آنے والا یا ٹکے والا؟''

''ٹکے والا۔''

منیجر مسکرانے لگا۔ میں نے چاہا اٹھ کر اس کا گلا اینٹھ دوں۔ سامنے میز پر ایک شخص سر رکھے جانے سو رہا تھا یا سوچ رہا تھا! پیالی میرے سامنے آئی۔ شاید کھانڈ کی جگہ گڑ ڈالا گیا تھا۔ مگر کھانڈ اور گڑ دونوں میٹھے ہوتے ہیں ——— پی جاؤ ——— میں پینے لگا! میز پر جھکے ہوئے صاحب کو ایک لڑکے نے بلایا۔ ''پروفیسر صاحب شام ہونے کو آئی۔ آپ کو گھر جانا ہوگا۔''

''چلا جاؤں گا بے۔'' وہ سر اٹھا کر بولے ''چائے لے آ۔'' اور جب لڑکا چلا گیا تو وہ میری طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ ''اے صاحب ادھر آجائیے۔ اکٹھے چائے پی لیں۔ انسان اکیلے بیٹھے بیٹھے تھک جاتا ہے۔ آپ واللہ یوں الگ تھلگ بیٹھے ہوئے بھدے معلوم ہو رہے ہیں اور میں گدھا!۔''

میں ہنسا۔ وہ بھی اس ہنسی میں شامل ہو گیا۔ اور ہوٹل کا منیجر

یوں ہنسنے لگا جیسے بڑے سے دیگچے میں کفگیر ہلا رہا ہے!

اور جب میں اس کے قریب آ گیا تو اس نے میری پیالی کو بغور دیکھا اور مینیجر کو مخاطب کر کے بولا "خان صاحب۔ یہ چائے کا رنگ کیسا ہے آج۔"

"جی یہ ٹکے والی پیالی ہے!"۔

پروفیسر نے مجھے گھورا اور مسکرا کر بولا۔ "آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

"یہیں کا۔" میں نے کہا۔

"کیا کرتے ہیں آپ؟"

"کوئی کام نہیں!"

"پڑھے لکھے ہیں آپ؟"

"جی ہاں۔"

"آپ کسی کام کے نہیں!"

وہ تازہ چائے میری پیالی میں ڈالنے لگا۔ اس کے سامنے ایک پلیٹ میں پیسٹری کا انبار سا پڑا تھا! —— میرا سوا روپیہ میری جیب میں تڑپ اٹھا!

آپ نے پڑھ لکھ کر اپنی زندگی تباہ کی۔ آپ اگر کسی کارخانے میں مزدور ہوتے تو اپنے اور اپنے ماں باپ کا پیٹ بھرنے کے لئے کچھ تو کما لیتے۔ اب آپ نمائش گاہ کی سیر کرتے پھر رہے ہیں۔ اور گو مجھے آپ کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن

میں یہ ضرور پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کے والدین کس حالت میں ہیں؟"

"بُری حالت میں۔"

"تو کسی دریا میں ڈوب مریئے، آخر زندگی کا کوئی مقصد تو ہونا چاہیئے۔ یہ کیا کہ گیند کی طرح کبھی ادھر لڑھک گئے اور کبھی ادھر لڑھک گئے، کوئی آدرش ہی نہیں۔ کوئی مدعا ہی نہیں۔ کوئی منزل ہی نہیں۔ یہ بہت بری بات ہے! ——— اور چند لمحے خاموش رہ کر وہ پکارے۔" اور چائے لانا بھائی"۔

"مگر میں تو بہت پی چکا"۔

"اور پی لیجئے صاحب۔ ایک دو پیالیوں سے کیا بنتا ہے!۔"

"میرا سوا روپیہ تڑپ اٹھا"۔

اس نے مجھ سے بہت باتیں کیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ صاحب کشفِ انسان ہے، جس نے میری روح کے داغ گن لئے ہیں، جس نے میرے احساسات پڑھ لئے ہیں، اور ان پر ایک سچے ہمدرد کی طرح نہایت بے دردی سے نشتر زنی کر رہا ہے، اور جب وہ تھیٹر کی دوسری گھنٹی سن کر اٹھا۔ بل ادا کیا اور مجھ سے مصافحہ کر کے دروازے سے باہر نکل گیا تو میں نے محسوس کیا کہ اس فرشتہ سیرت انسان نے میرے جذبات و تخیلات کی کایا پلٹ دی ہے، میں اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا!

اپنی روح کی خلوتوں میں نئے عزم کی بنیاد رکھ کر میں ہوٹل سے

باہر آیا۔ چپے چپے کی سیر کی۔ مگر اب میرا زاویۂ نگاہ ہی بدل چکا تھا۔ میں بہت دیر کے بعد ایک امن پسند شہری بن کر نمائش گاہ کے بڑے گیٹ سے باہر نکل کر سڑک کے کنارے لوگوں کے ہجوم کو بغور دیکھنے لگا کہ شاید وہ پروفیسر صاحب مجھے مل جائیں اور میں ان سے مشورہ کر کے اپنے مردہ مستقبل میں زندگی کی لہر دوڑا سکوں!

ایک بار میں نے پلٹ کر شیشم کے درخت کی طرف دیکھا۔ وہی نوجوان مجھے اسی جگہ اسی حالت میں مغموم و مضطرب کھڑا نظر آیا۔

میرا دماغ چکرا سا گیا۔ بڑھ کر اس سے پوچھا۔ "بھئی کون ہو تم؟ تم بڑی دیر سے یہاں کھڑے ہو۔ تمہیں کس کی تلاش ہے؟"

بھیگی ہوئی آنکھیں ایک بار جھپکیں اور دو آنسو اس کے خشک مرجھائے ہوئے رخساروں پر گر کر لبوں کے گوشوں کی طرف بہنے لگے۔ اس نے میری طرف دیکھا پھر ہجوم کو گھورنے لگا اور مشین کی طرح بول اٹھا۔ "میری ماں مر گئی ہے!"

"مجھے تم سے بے حد ہمدردی ہے لیکن تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میرے ابا اندر ہیں۔ انھیں بتانا ہے۔"

"اچھا تو آج وفات ہوئی ہے ان کی؟"

"جی ہاں۔"

"کس وقت؟"

"صبح کو۔"

"اور اب تک آپ کے والد صاحب ———!"

وہ میری بات سننے کے بجائے، بجلی کی سی تیزی سے ہجوم کی طرف لپکا اور ایک شخص سے چمٹ گیا۔ "ابا ——— ابا جان ——— امی مر گئی ——— امی مر گئی ابا جان!"

میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ نوجوان اسی پروفیسر سے لپٹا ہوا تھا۔ وہ چلائے جا رہا تھا۔ "ابا۔ امی مر گئی ——— آج صبح کو ——— ابا!"

لیکن پروفیسر چپ چاپ آگے بڑھتا گیا۔ میں اس کے سامنے آگیا اور ادب سے کہا۔ "پروفیسر صاحب آپ کی اہلیہ محترمہ آج صبح کو ———"

"بکواس بند کرو۔" وہ لال لال آنکھیں نکال کر کھانسا ——— ہوا شراب کی بو سے متعفن ہو گئی۔ لڑکھڑا کر ایک اکے پر چڑھا اور یہ جا وہ جا دور سڑک پر غائب ہو گیا!"

لیکن نوجوان برابر پکارتا رہا۔ "ابا ——— ابا ——— امی کے کفن دفن کے لئے چند پیسے دیتے جاؤ ——— ابا!"

وہ اس زور سے چیخ رہا تھا کہ اس کی گردن کی رگیں لوہے کی سلاخوں کی طرح ابھر ابھر پڑتی تھیں۔ اور جب وہ مایوس ہو کر پلٹا تو میں نے اس کی آنکھوں میں شعلے بھڑکتے دیکھے۔ اس کا سارا جسم کپکپا رہا تھا۔ اور اس کے ہاتھوں کی انگلیاں اکڑ رہی تھیں!

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بے فکر رہو بھئی ———

چلاؤ نہیں، میں سب انتظام کر دوں گا!"

اس نے محبت بھرے انداز سے میری طرف دیکھا۔ اور جب بوکھلائے ہوئے ہجوم سے نکل کر ہم ایک گلی میں آئے تو میں نے کہا یہ لو سوا روپیہ میرے پاس اس وقت یہی کچھ ہے موٹے کپڑے کے کفن پر ایک روپیہ خرچ آجائے گا۔ چار آنے گورکن کو دے دینا۔"

"اور جنازہ پڑھنے والے مولوی صاحب۔ وہ تو ایک روپے کے بغیر جنازہ پڑھانے سے بھی انکار کر دیں گے!"

میں اسے بھگا کر اپنی کوٹھڑی میں لے آیا۔ سب سامان باہر سڑک پر نکال کر میں نے چلانا شروع کیا۔ "ایک سوٹ کیس —— ایک کوٹ —— ایک بستر —— ایک کھاٹ —— سب کے لئے کچھ بولو!"

لوگ اکٹھے ہو گئے!

"ان چار چیزوں کے لئے کچھ بولو!" میں پکارا۔

"ایک روپیہ!" ایک شخص نے کہا!

"ایک روپیہ؟" میں نے پوچھا۔ "اچھا ایک روپیہ —— ایک دو تین!"

لوگ منہ کھولے ایک دوسرے کو گھورنے لگے!

میں نے روپیہ لے کر نوجوان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے چند الفاظ میں مجھے اپنے مکان کا پتہ بتایا اور مٹھیاں بھینچ کر بازار میں

پاگلوں کی طرح اس تیزی سے بھاگا کہ دو چار موٹریں پیچھے رہ گئیں!

میری مذبذب روح کو اچانک ایک دھکا سا لگا۔ لیک کریں نے اپنی کوٹھڑی کو دیا سلائی دکھا دی اور جب اس سے شعلے بلند ہونے لگے تو میں دیوانوں کی طرح نمایش گاہ کی طرف یہ چلاتا ہوا بھاگا میں سارے شہر کو آگ لگا دوں گا —— ساری دنیا کو آگ لگا دوں گا —— ساری کائنات کو آگ لگا دوں گا!"

کہتے ہیں میں ایک موٹر کے نیچے آکر ریڑھ کی ہڈی تڑوا بیٹھا۔ آج کل ہسپتال میں ہوں!

کوئی کیا جانے کہ ہسپتال سے نکل کر —— ہسپتال سے نکل کر! ——!

---